پاکستان اور اچھوت

چودھری افضل حق (احرار)

مکتبہ اردو لاہور

پاکستان اور چھوت

چودھری افضل حق

مکتبہ اردو لاہور

طبع اوّل

تعداد ایک ہزار

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشر چھپکر مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوئی

مندرجات

پیش لفظ

ہندوستان کا فرقہ دارانہ مسئلہ ایک عجیب اور پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ اکثریت کی غیر رواداری نے مسلمانوں کو تقسیمِ ہند کے مطالبہ پر مجبور کر دیا ہے۔ ملک کی ہر جماعت اور ہر طبقہ نے اسلامیانِ ہند کے اس مطالبہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ پیشِ نظر کتاب مجلس احرار کے نقطۂ نظر کی مظہر ہے۔

قبلہ چودھری افضل حق صاحب علیہ الرحمۃ اردو کے بہترین و کامیاب ادیب تھے لیکن پاکستان کا مسئلہ اپنی ہمہ گیری کی وجہ سے اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ یہ کتاب[1] اردو نہ جاننے والے لوگوں تک بھی پہنچ جائے۔ چنانچہ مرحوم نے بجائے اردو کے انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ مگر ملک کے اردو خواں طبقہ نے مطالبہ کیا کہ اسے اردو میں بھی شائع کیا جائے۔ چنانچہ مرحوم کے ارشاد پر میں[2] نے اس کا ترجمہ کیا جو ان کی خواہش اور اجازت سے اخبار "زمزم" لاہور میں بالاقساط چھپا۔

ارادہ تھا کہ اسے کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے لیکن کاغذ کی گراں یابی بلکہ نایابی نے اس خواہش کی تکمیل میں صبر آزما التوا پیدا کر دیا اور کچھ عرصہ سے تو اس کے چھپنے کی کوئی امید باقی نہ

---

[1] چودھری صاحب نے یہ کتاب راولپنڈی جیل کے زمانۂ اسیری میں لکھی تھی۔

[2] مصنف کے تمام خیالات سے مترجم کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

رہی تھی۔ مگر مکتبہ اردو کے ارباب اہتمام کو مرحوم سے جو یک گونہ تعلق تھا۔ اس کی بنا پر اس کے حسّاس اور رجواں کارناظم چودھری نذیر احمد صاحب نے اس کی اشاعت کا ذمہ اٹھایا۔ اور یہ صرف ان کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ یہ ترجمہ آج کتابی صورت میں قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

میں اپنے دوست جناب تابش صدیقی بی۔اے کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ترجمہ میں میرا ہاتھ بٹایا۔

یہ احسان شناسی ہوگی اگر میں اس جگہ عزیزی یونس عثمانی کا ذکر نہ کروں۔ اصل مسوّدہ کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے اخبار "زمزم" کے پرچوں کی تلاش میں میرے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھائیں اور گرد سے اَٹی ہوئی الماریاں چھانیں۔

اکرام قمر

مسئلہ

مسٹر جناح نے ایک بیدرد دہشت پسند کی طرح ہمارے درمیان ایک بم پھینکا ہے جس سے انتشار اور ابتری پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ آج متحدہ عمل وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی کٹر قوم پرست جناح اول درجے کا فرقہ پسند بن چکا ہے ہمیں اس سوال پر اچھی طرح سوچ وچار کرنی چاہیئے مسٹر جناح کی زیرِ قیادت مسلم لیگ نے تقسیمِ ہند کی جو قرارداد منظور کی ہے اسے اگر کلیتہً شر انگیز نہیں کہا جا سکتا تو کم از کم اسے مصلحتِ وقت کے خلاف ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ ہندوستانی سیاست ایک سخت مرض میں مبتلا ہے جناح ایک ہوشیار سیاست دان ہے۔ اور اس نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی چپقلش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور زخم پر پھاہا رکھنے کے بجائے خنجر سے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا مناسب سمجھا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مسلم لیگی رہنما قراردادِ لاہور کے منطقی نتائج اخذ نہ کریں۔ مگر تحریک

شروع ہو چکی ہے اور اس کے دور رس اثرات سے آنکھیں نہیں موندی جا سکتیں مسلمانوں کے
ایک علیحدہ قوم ہونے کا نعرہ مسلم عوام پر یقیناً گہرا اثر مترتب کرے گا مسلمان سرمایہ داروں کے
تفسیمی رجحانات کو آسانی سے روکا نہیں جا سکتا مسلمان جنتا سرمایہ داروں کے قبضہ میں
ہے۔ اونچے طبقوں کے خیالات کا تمام مسلم قوم کے ذہن پر چھا جانا ایک یقینی بات ہے۔
موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ آئندہ اختلافات اتنے بڑھ جائیں گے
کہ گذشتہ فرقہ دارانہ فسادات مستقبل کے فسادات کے سامنے ماند پڑ جائیں گے مسٹر جناح کی
تجویز ایک مردہ بچہ کا جنم نہیں ہے بلکہ لیگ نے کئی سروں ڈال دیا جاہے اور اگر اس پر پوری طرح
قابو نہ پایا گیا تو یہ بہت زیادہ ضرر کا باعث ہو گا حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ لیگی قرار داد نے جو
پریشان کن صورت پیدا کر دی ہے اس پر کس طرح قابو پایا جا سکتے ہیں تو یہ کہوں گا کہ ہمیں پہلے
اس مطالبہ کی پشت پر کام کرنے والی طاقتوں کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنا چاہیئے اور نسخہ تجویز
کرنے سے پہلے مرض کے اسباب معلوم کرنے ہوں گے۔

دنیا آج اس بات پر حیران ہے کہ کس طرح نازی لیڈروں نے آریہ نسل کی فوقیت کے
لغو نظریہ پر اپنا اقتدار استوار کیا ہے۔ اور یورپ کی متمدن ترین قوم نے چپکے سے غیر مہذب ہٹلر
کی قیادت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ ہندوستانی سیاست کو سلجھانے کے لئے فرقہ دارانہ
تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ بلند بانگ دعاوی اور غیر ضروری فرسودہ باتیں عبث ثابت
ہوں گی اور ان سے صورتِ حال اور پیچیدہ ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانوی راج
سے پہلے بھی یہاں فرقہ داری موجود تھی۔ اور بدیشی اقتدار کے بعد بھی موجود ہے۔ ہمارے قومی رہنماؤں
نے اس مسئلہ کے حقائق پر نگاہ نہیں ڈالی۔ چنانچہ اب حالت ناقابلِ اصلاح ہو چکی ہے۔ مجھے اس کا
اعتراف ہے کہ ہمارے نیتاؤں نے ملک کے سیاسی مسائل پر قابو پانے کی بڑی تندہی سے

کوشش کی ہے لیکن ان کی یہ کوشش بہت زیادہ زیرک و دانشمندانہ نہ تھی ہم ہمیشہ یہ خیال کر
کے مطمئن ہو گئے - کہ مسلم عوام چند سیاسی حقوق کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اور ملک کے فرقہ دارانہ
سوال کا اس کے سوا اور کوئی پہلو نہیں۔ اس واہمہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے لیڈروں نے فرقہ دارانہ
سوال پر ایک غلط زاویہ سے نگاہ ڈالی حقیقت میں یہ مسئلہ سیاسی بھی ہے اور مذہبی بھی، تاریخی
اور مجلسی و اقتصادی بھی۔ مگر اس کے مذہبی پہلو کو غیر ضروری اہمیت دے دی گئی ہے۔ اور
مجلسی و اقتصادی پہلو بالکل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ ہماری غلط
رہنمائی کر رہی ہے تقسیمِ ہند کا نعرہ کیوں زور پکڑتا جا رہا ہے؟ اس کی وجہ واضح ہے مسلم عوام
ہندو کے خلاف بھرے بیٹھے ہیں لیکن کیوں؟ اس سوال کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے وہ ہندو
کے پسندِ خاطر نہیں ہو گا۔ اور جو حل میں نے پیش کیا ہے۔ اس کے اساسی اصول مسلم لیگیوں
کو مرغوب نہیں ہوں گے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس سوال کا جو مطالعہ میں نے کیا ہے وہ
اسّی فی صدی درست ہے اور جو علاج میں نے تجویز کیا ہے وہ سو فی صدی صحیح ہے۔ میں
یہ جانتا ہوں کہ کٹر قوم پرست اور سخت فرقہ پرست میری اس کتاب پر ناک بھوں چڑھائیں گے
مگر میرا اس کتاب کے لکھنے سے مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کی اشاعت عام اور مقبولیت ہمہ گیر
ہو میرے سامنے صرف ایک مقصد ہے۔ میں ملک کے تمام فرقوں کے اعتدال پسند عناصر
کے سامنے مسئلہ کا اصلی رُخ پیش کرنا چاہتا ہوں ہٹلر کے نسلی تفوق کا نظریہ ہمیں ایک مہیب
مذاق معلوم ہو سکتا ہے مگر اس نظریہ کی پشت پر شکایات کی ایک ٹھوس چٹان ہے۔ ورسائی
میثاق نے جرمن قوم پر نہ صرف سیاسی غلامی ہی ٹھونسی بلکہ اسے اقتصادی طور پر قلاش بھی کر
دیا میثاق ورسائی سے جرمن قوم پر جن مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں اگر میں اس کا ایک چوتھائی
بھی بیان کر دوں تو یقیناً آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ "احمق کی باتیں" کا فاضل مصنف

لکھتا ہے "نازی عہد سے پہلے برلن کے گلی کوچوں میں انسان بکتے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں بھوک کے سبب ذلیل سلوک بھی برداشت کرتے۔ اور بدیشی مذاق کے وحشیانہ پہلو کی تسکین چند سکوں کے عوض بخوبی ہو سکتی تھی"۔ اس لئے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ جرمنی میں ہٹلر نے کوئی عجوبہ نہیں کیا۔ بلکہ عوام کے مصائب نے جرمن قوم کو اس کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ جب کوئی معقول شکایت اور مضبوط احتجاج موجود ہو تو جذبات کو بآسانی بھڑکایا جا سکتا ہے نعرے تو صرف شکایات کا مظاہرہ ہیں بعض اوقات مطالبات کے لئے بیّن طور پر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے اور ان کے حق میں بودے دلائل پیش کئے جاتے ہیں لیکن کوئی معقول شکائیت اگر موجود ہو تو ایک خوبصورت وعظ کے بجائے بیہودہ نعرے زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ مسٹر جناح کے دلائل تو غلط ہو سکتے ہیں لیکن یہ امر کہ مسلمان عوام اپنی علیحدہ قومیت کی تحریک کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں کوئی معقول شکائت ہے جس کی فوری تلافی ضروری ہے میں یہ مانتا ہوں کہ ایک غیر دانشمند قوم میں جذبات کو ایک مختصر سے عرصہ کے لئے مشتعل کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی معقول شکایت اگر موجود نہ ہو تو ایسا ہمیشہ نہیں ہو سکتا۔

لالہ لاجپت رائے پنجاب کے ایک زیرک نیتا تھے۔ انہوں نے پنڈت مدن موہن مالویہ جی کے ساتھ مل کر ۱۹۲۶ء میں ہندوؤں کو مشتعل کرنا شروع کر دیا اور ان کے سامنے پٹھان حملہ اور مسلم اقتدار کا خطرہ بیان کیا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی گراں قدر خدمات کی تھیں۔ ان کی زوردار تقریروں نے ہندو مہاسبھا کے لئے میدان صاف کر دیا۔ کونسل کے انتخابات میں کانگرسی امیدواروں کو شکست فاش ہوئی۔ اور ۱۹۲۶ء کے عمومی انتخابات میں بڑے بڑے کانگرسیوں کو بھی ضمانت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ تمام شمالی ہند کے ہندو عوام نے مالویہ جی اور لالہ جی کا ساتھ دیا اور کانگرس کو دھتا بتایا جب انتخابی جوش کچھ ٹھنڈا ہوا تو

ہندو عوام کے دماغ پھر توازن پر آ گئے۔ پٹھان حملہ کا کوئی بھی خطرہ موجود نہ تھا۔ چنانچہ اب ہندو عوام یہ محسوس کرنے لگے کہ انہیں احمق بنایا گیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ہندو مہا سبھا کی غلط قیادت کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مسلم اقتدار اور پٹھان حملہ کے خطرہ کا نعرہ محض ایک طلسمِ فریب تھا۔ چنانچہ ہندو عوام پر یہ بیہودہ نعرہ ہمیشہ متسلّط نہ رہا۔ ہندو مہا سبھا کے نیتا اپنی قوم کی نظروں میں گر گئے اور کانگریس اس کشمکش میں بالآخر کامیاب و کامران رہی مگر مسلمانوں میں معاملہ برعکس ہے۔ مسلم عوام ہمیشہ مسلمان سرمایہ داروں اور فرقہ پرست لیڈروں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں۔

مجھے مسٹر جناح کی بنیادی غلطیاں تلاش نہیں کرنی، بلکہ مجھے تو مرض کی تشخیص کے بعد ایک نسخہ تجویز کرنا ہے۔ میرا ان لوگوں سے کوئی جھگڑا نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسلم عوام بے بنیاد باتوں سے دوسری قوموں کی نسبت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن میں یہ ماننے کو بھی تیار نہیں کہ یہ صورتِ حال صرف جذبات کی تخلیق ہے۔ اور مسلمان بغیر کسی وجہ کے ہندو کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ذاتی وجہ موجود نہ ہو، لیکن اس چپقلش کیلئے فرقہ دارانہ وجوہات یقیناً موجود ہیں۔ ہمیں یا تو ایک دوسرے کی مشکلات کو محسوس اور انہیں دور کرنا ہوگا اور یا مقدّر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہوگا۔

مذہب

لفظ قوم کی اصطلاح پر غور و فکر کرنا ایک بڑی دردسری ہے لیکن ہندوستانی زندگی سے اچھی طرح واقفیت رکھے بغیر یہ کہنا کہ ہندوستانی ایک قوم ہیں یا نہیں۔ اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے قوم کی اصطلاح عموماً ان لوگوں پر منطبق ہوا کرتی ہے جو ایک ہی زبان، ایک ہی تاریخ اور ایک ہی مذہب رکھتے ہوں۔ لیکن اس اصطلاح کو زیادہ جامع اور موجودہ ضروریات کے مطابق بنانے کے لئے ان میں تین اور اجزاء ـــــ مشترکہ سماجی رسوم، مشترکہ سیاسی ادارے اور مشترکہ اقتصادی حالات ـــــ بھی شامل کر لینے چاہئیں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کی اکثریت آریہ حملہ آوروں کی براہِ راست اولاد ہے۔ یہ آریہ حملہ آور زمانہ قبل از تاریخ میں شمال مغربی ہندوستان میں آ مقیم ہوئے تھے۔ منگلوں، افغانوں اور عربوں کی اولاد ہندوستان میں خال خال ہے۔ اس لئے مشترکہ قومیت میں اگر لے شمار رکاوٹ

پنہاں ہیں۔ اور قومیت کی بنیاد مشترکہ نسل پر ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو موجودہ زمانہ کے برعکس صلح صفائی اور اتفاق کے ساتھ رہنا چاہیئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے تعصبات کی بنیاد نسلی تنفر پہ نہیں۔ تو کیا مذہبوں کے اختلاف نے ایک ہی قوم کے لوگوں کو دست و گریبان کر رکھا ہے؟ بہت سے اصحاب اس سوال کا جواب اثبات میں دیں گے لیکن میں اس جواب سے اختلاف کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرا یہ اختلاف ان کے دیرینہ عقائد میں زلزلہ پیدا کر دے گا۔ یہ تاریخ کی سب سے بڑی ستم ظریفی ہے کہ اسلام اور ہندومت اپنی انتہائی روادارانہ تعلیمات کے باوجود بعض واقعات کی بناء پر اپنے پیروؤں میں رواداری پیدا نہیں کر سکے۔ ان دونوں مذاہب کی تعلیمات میں کوئی نقص نہیں ہے۔ دونوں مذہب امن و آشتی اور خدمتِ خلق کا درس دیتے ہیں۔ اس لئے یہ مذہبی کی بجائے دوسرے انقلابی حادثات ہیں جو موجودہ صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔

سناتنی ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ برہما ایک عالمگیر روح ہے۔ ہر چیز اسی سے نکلی ہے اور یہ روح تمام اشیاء پر مشتمل ہے یہ عقیدہ ہندومت کو تمام دنیا جتنا وسیع کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک سناتنی کے لئے مذہب کے ظاہری اختلافات کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں۔ اس کے نزدیک مختلف اعتقادات کا اختلاف بھگوان کی لیلا ہے۔ ہر شخص کو ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دنیا میں اپنے فرائضِ منصبی سے بخوش اسلوبی عہدہ برا ہونا چاہیئے۔ ہر وہ شخص دیوتا ہے جو دوسروں کی سیوا کرتا ہے۔ اور اس میں بھگوان کا روپ ہے۔ جو شخص اپنی عقلمندی اور محنت سے شہرت و عزت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایشور کا اوتار ہے۔ رام اور کرشن اپنے جنگی کارناموں کی وجہ سے اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کی پوجا ہوتی ہے۔ ویدانت کا ایک فلسفہ اس اعتقاد کی پوری طرح حمایت اور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

بھگوت گیتا میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مختلف راستوں سے سچائی حاصل کی جا سکتی ہے یعنی سناتنی عقائد نے غیر روا داری کا خاتمہ کر دیا ہے اور چھوٹے چھوٹے تعصبات کو بالکل غیر اہم بنا دیا ہے۔ دراصل ہندو وہ ہے جو دوسروں کو کبھی دکھ نہ دے اور ہر شخص کے ساتھ پیار سے پیش آئے۔ فلسفہ ویدانت کی بنا پر وہ صابر، متحمل مزاج اور قانع بن جاتا ہے۔ ہندو مت پر دوسرے پہلوؤں سے اعتراض کئے جا سکتے ہیں لیکن کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جہاں تک ہندوؤں کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے ایک ہندو نروان حاصل کرنے کے لئے مذہبی اعتقاد کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ایک ہندو برہما، وشنو، شو اور اندر میں اعتقاد رکھ سکتا ہے۔ اگر وہ انہیں جھٹلاتے تو اس کے ہندو ہونے میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایک ہندو کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ویدوں میں یقین رکھے۔ نہ اس پر پرانوں کے ماننے کی پابندی ہے ہندو مت میں ان چیزوں کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کو کچھ اہمیت نہیں دی جاتی اس مست کا دوسروں کے عقائد سے قطعاً کوئی جھگڑا نہیں۔ مندر کو جاتا ہوا ہندو راستہ میں ایک مسلم فقیر کی قبر کو بھی سجدہ کر سکتا ہے۔ وہ تعزیہ کو بھی احترام سے کندھا دے سکتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کو قتل نہیں کرے گا۔ حتیٰ کہ اس کے گھر میں جو سانپ نکلے وہ اسے مارنے کی بجائے دودھ پلاتا ہے۔ ہندو مت یقیناً پیار اور آشتی کا مذہب ہے۔

اسلام بھی امن و محبت کا علمبردار ہے۔ اگرچہ ہر مسلمان خدا کا سپاہی ہے۔ اس پر خدا کی اطاعت لازمی ہے۔ دنیا میں یہ غلط نظریہ پھیل چکا ہے کہ ایک سپاہی صلح کُن اور امن کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔ اسی غلط نظریہ کی بناء پر اسلام کو جنگجو مذہب سمجھا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں پر ایمان و اعتقاد کے مسائل کی پابندی کے سلسلہ میں کسی قسم کی نرمی کو روا نہیں رکھتا۔ لیکن غیر مسلموں کے لئے اس کا پیغام محبت اور رواداری کا ہے۔ مسلمان چونکہ

اپنے مذہب کے بارے میں سخت ہے۔ اس لئے اُسے غیر مسلم متعصب سمجھتے ہیں۔ جو نکتہ چین اسلام کی خوبیاں اُجاگر کرنے کی بجائے اس میں کیڑے نکالتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو نہایت گھناؤنی شکل میں پیش کیا ہے۔

اسلام میں نسل و نسب کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ یہ غیر طبقاتی سماج قائم کرنا چاہتا ہے اسلئے اس کے اصول غریبوں اور مزدوروں کے مناسب حال ہیں۔ یہ ظلم و استبداد کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ "مذہب میں کسی قسم کی سختی نہ کرو۔ سچائی جھوٹ سے متمیز ہے جو برائی کو چھوڑ کر خدا میں یقین کرتا ہے۔ اس نے سب سے زیادہ قابلِ اعتبار گرفت پر قبضہ کر لیا ہے یہ گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہوتی۔ خدا ہر چیز سنتا اور دیکھتا ہے"

ایک مسلمان دوسروں کو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کی دعوت تو دے سکتا ہے لیکن کسی کو بزور مسلمان بنانا تو درکنار تبلیغ کے سلسلہ میں درشت الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے "سب کو اپنے رب کے راستہ کی طرف بلاؤ عقلمندی اور نرمی کے ساتھ۔ ان سے بہترین انداز میں بڑی خوش خلقی کے ساتھ بحث کرو۔"

مسلمان دوسرے مذاہب کے دیوی دیوتاؤں اور خدا کو برا بھلا نہیں کہہ سکتا۔ "وہ جن کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ تم انہیں برا بھلا نہ کہو۔ کیونکہ وہ غصہ میں آکر کہیں اپنی لاعلمی اور جہالت کی بنا پر خدا کو کوسنا شروع نہ کر دیں۔"

قرآن کے بعد مسلمان حدیث کو درجہ دیتے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ کریمؐ کے ایک صحابی حضرت عبداللہؓ بن عمر نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی۔ ایک یہودی ان کے ہمسایہ میں رہتا تھا۔ حضرت عبداللہ نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ آیا اس نے یہودی ہمسایہ کو گوشت بھیجا ہے یا نہیں۔ انہوں نے منفی میں جواب دیا۔ تو حضرت عبداللہ نے کہا۔" اسے فوراً کچھ گوشت

بھیج دو کیونکہ میں نے رسولِ کریمؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ان پر حضرت جبریلؑ نے ہمسایہ کے حقوق کے سلسلہ میں اتنا زور دیا ہے کہ بعض اوقات وہ یہ سمجھنا شروع کر دیتے تھے کہ کہیں ہمسایہ وراثت میں بھی حصہ دار نہ ہو جائے۔"

یہ یاد رہنا چاہیئے کہ اسلام ہندو اور مسلمان ہمسایہ میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا اور سب کے ساتھ ایک سا سلوک کرتا ہے۔

ایک دوسرے صحابی حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خداؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس شخص سے اس کے ہمسائے امن میں نہیں۔ وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔

پیغمبرِ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ "تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنے ہمسائے سے محبت نہ کرو گے۔" ایک اور حدیث بھی اسی مضمون کی ہے کہ "اگر تم خدا اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہمسایوں کی خدمت کرو۔"

سینکڑوں حدیثیں اس قسم کی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام ہر مسلم اور غیر مسلم ہمسایہ کا بہت احترام کرتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اختلافِ مذاہب کو کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ رسولِ پاکؐ کا واضح حکم موجود ہے کہ اپنے غیر مسلم رشتہ دار کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ اور ضرورت کے وقت اس کی مدد کرو۔

ایک مسلمان ایک غیر مسلم اہلِ کتاب عورت سے شادی کر سکتا ہے۔ اور اس عورت کو اپنی مذہبی اور معاشرتی رسوم پر کاربند ہونے کی اجازت ہے۔

غیر جانبدار رہنے میں انصاف مشکل نہیں ہے لیکن انسان کی انصاف پسندی کا اصلی امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اسے ان لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا ہو جو اس سے نفرت کرتے ہوں۔ ایک مسلمان کے لئے یہ لازمی ہے کہ بلند تر اخلاقی قانون کی پابندی کرے۔ قرآن مجید میں لکھا ہے کہ

"اے وہ جو ایمان لائے ہو اللہ کے راستہ پر استقلال کے ساتھ ڈٹ جاؤ۔ دوسروں کی نفرت تم سے ظلم اور ناانصافی نہ کرائے۔ انصاف کرو۔ تقویٰ کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے ہر فعل سے واقف ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی پابندی نے نہیں۔ بلکہ مذہب سے غداری نے اس ملک کو دنیا میں دوزخ بنا رکھا ہے۔ مذہب کے خلاف ہر قسم کی تحریک لایعنی ہے۔ اور جتنی جلدی بند ہو جائے مفید ہے کیونکہ ہندو مت اور اسلام دونوں ہی نفرت کی بجائے محبت کے پیغامبر ہیں ہمیں متحد ہو کر اُن لوگوں کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیئے جو مذہب کے نام پر غیر مذہبی فعل کرتے ہیں مجھے یہ اعتراف ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہندو مت سے جدا ہے۔ اسلامی عقیدہ یہ ہے۔ کہ خدا اپنے نبی بھیجتا ہے۔ خود کسی شکل میں نمودار نہیں ہوتا لیکن ہندو مت میں معاملہ بالکل برعکس ہے مگر رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اسلام کے مذہبی اعتقادات میں نئے نظریے اور اصول داخل ہوتے چلے گئے ہیں بعض صوفیا نے اس مذہب کی تمام ہیئت کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اسے سناتنی ہندوؤں کے ویدانتی فلسفہ کے مشابہ بنا دیا ہے۔ وہابیوں اور موحدوں نے صوفیوں کی اس کوشش کی سخت مذمت کی۔ مگر امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان مخالفتوں کے باوجود ہندوستان کے اسی فی صدی مسلمان صوفیا کے مذہب پر کاربند ہیں صوفیا کا تصوف فلسفۂ ویدانت سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ اس لئے مسلم عوام کے مذہبی رواج ہندوؤں کے سے ہیں۔ اگر ہندو کسی دیوتا کی مورتی کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو مسلمان بھی پیروں فقیروں کی قبروں کو سجدہ کرتے ہیں اسلام میں رقص و سرود کی ممانعت ہے مگر ہر خانقاہ میں میٹھے گیت سنائی دیتے ہیں۔ اور دلکش ناچ دیکھنے میں آتے ہیں بعض پیر وجد میں آ کر خود رقص شروع کر دیتے ہیں طوائفوں کے رقص و سرود سے وہ اتنے بیخود اور مسحور ہو جاتے ہیں کہ ان کی پگڑیاں کھل کر ان کی گردنوں میں آ پڑتی ہیں۔ اور وہ

بچوں کی طرح رونا چلانا شروع کر دیتے ہیں مسلمان صوفیوں کے مقبروں پر عام بازاری عورتوں نے دیو داسیوں کی جگہ لے لی ہے ہندوؤں کی طرح رقص و سرود اب مسلمانوں کے بھی مذہب کا ایک حصہ بن گیا ہے مسجد کے سامنے باجہ کا سوال محض ایک سیاسی حربہ ہے مسلمان فقیروں اور پیروں کے مزاروں پر مسجدوں کے سامنے ہر روز رقص و سرود کی محفلیں جمتی ہیں. کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کرتا جو کوئی بھی آواز اٹھاتا ہے۔ اس کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

اگر پہلی صدی ہجری کا کوئی مسلمان کسی طور زندہ ہو کر موجودہ ہندوستان میں آئے تو وہ فوراً پکار اُٹھے. کہ یہاں کے اسّی فی صدی مسلمان کافر ہیں اور انہوں نے محض سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو مسلمان کہلانا شروع کر دیا ہے، وہ مسلمان یہی کہے گا کہ ہندوؤں اور مبیّنہ مسلمانوں میں کسی قسم کا مذہبی اختلاف موجود نہیں ہے، جاہل عوام زندہ پیر اور مُردہ فقیر کی پیغمبر سے زیادہ عزت کرتے ہیں پیغمبر کو خدا سمجھا جاتا ہے۔ اور اصلی خدا کو کوئی بھی خاطر میں نہیں لاتا. ذیل میں وہ چند شعر درج کئے جاتے ہیں. جو مسلمان خانقاہوں میں میراثی اور رقاصہ عورتیں گاتی ہیں۔ اور حاضرین ان پر سر دھنتے ہیں ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے	جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے
جو مستوی تھا سر عرش پہ خدا ہو کر	اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر
کل تو مندر میں برہمن کو دیئے تھے درشن	آج مسجد میں مسلمان بنے بیٹھے ہیں
محمدؐ سرِ وحدت ہے کوئی یہ رمز کیا جانے	شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

آج کل کے مسلمان صرف پیغمبر ہی کو خدا کا درجہ نہیں دیتے بلکہ حقیقی ویدانتی فلسفہ کے مطابق سلسلہ طریقت کے ہر مرشد کو خدا کی انسانی شکل سمجھا جاتا ہے مثلاً ؎

چاچڑ وانگ مدینہ دِسّے کوٹ مٹھن بیت اللہ	ظاہر دے وچ پیر فریدن باطن دے وچ اللہ

برائے چشمِ بینا از مدینہ بر سرِ ملتاں
بشکلِ صدر دیں خود رحمۃ اللعالمین آمد

سُن کڑے برنگی مولا بن آیا ناسوتی ہے!
احدِ حقیقی بن احمدؐ آیا ایہہ ملنگ بھبھوتی ہے

مسلم عوام کے مذہبی اعتقادات پر یہ ایک طائرانہ نظر ہے اس قسم کے صوفیانہ خیالات کا اظہار پہلے تو صرف خانقاہوں تک محدود تھا۔ اور مسجدوں میں خدا اور بندے کا امتیاز باقی تھا۔ مگر اب مسجد کے منبروں پر بھی تصوّف یا فلسفہ ویدانت قبضہ کر چکا ہے میں نے مشہور مسجد شاہ محمد غوث بیرون دہلی دروازہ لاہور میں قوالوں کو اسی قسم کی تمثیلی نظمیں پڑھتے سنا ہے۔ اور لوگوں کو مسجد کے منبر کے آس پاس وجد میں آ کر ناچتے ہوتے دیکھا ہے۔ میرے وطن گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور کی جامع مسجد کی اندرونی دیواروں پر یہ شعر کندہ ہیں ؎

بندہ از بندگی خدا گردد
نتواند کہ مصطفےٰ گردد

قطرہ در آب رفتہ آب شود
نتواند کہ دُرِ ناب شود

حالانکہ یہ جذبات اسلامی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہیں لیکن کوئی شخص ان کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتا جو بھی ایسا کرے گا اس کی جان کا مرکوئی لاگو ہو جائے گا۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر بدعات کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ آپ کی قبر کچی بنائی گئی تھی لیکن تین سو سال بعد ان کے عقیدتمندوں کے سروں پر اب یہ شوق سوار ہے کہ ان کی قبر پر عالیشان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ وہابیوں کا طبقہ آج تک پکی قبر کا مخالف ہے مگر تصوّف مسلم عوام کے ذہنوں پر اب چھا چکا ہے اور وہ ہندو رسوم کی طرف مائل ہیں۔ اگرچہ اس میلان کے راستہ میں آریہ سماجی پراپاگنڈا حائل ہو گیا ہے تاہم مسلمانوں کے موجودہ رواج اور خانقاہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد یہ ظاہر کر رہی ہے۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں بُعد المشرقین نہیں۔ مگر اس تصوف اور فلسفہ ویدانت کے باوجود دونوں قوموں کے تعلقات پہلے سے زیادہ کشیدہ ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں

نے اپنے مذہب کو ہندو مت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ تاہم فرقہ دارانہ جھگڑوں کی واحد وجہ مذہبی اختلافات سمجھے جاتے ہیں۔

حالات کا سطحی مطالعہ کرنے والے میرے اس خیال کو جھٹلانے کی کوشش کریں گے۔ کہ اگر آریہ سماج کی تحریک جاری نہ ہوتی تو مسلمان ہندو مت کی طرف اور زیادہ جھک جاتے۔ بلکہ مجھے یہ یکا یقین ہے کہ اگر ہندوؤں کے مشہور عالم اور بہی خواہ سوامی دیانند پیدا نہ ہوتے تو مسلمانوں میں یہ بیس فی صدی موحد بھی نظر نہ آتے جو آج ہندوستان میں موجود ہیں۔ آریہ سماج کے رہنماؤں نے اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔ اس مخالفت سے پہلے مسلمانوں میں کسی قسم کی مذہبی سرگرمی موجود نہ تھی۔ اور وہ اچھوتوں کی حیثیت میں ہندو سماج میں مدغم ہونے ہی والے تھے لیکن اسلام کے خلاف آریہ سماجی پرچار نے بعض مسلمان علماء میں حرکت پیدا کی اور ان علماء نے ملک کے مختلف حصوں میں عربی مدارس جاری کر دیئے۔ انہوں نے ہندو رسوم ترک کرانے کی تحریک شروع کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ہندو اور مسلمان عوام پہلی دفعہ دو مخالف گروہوں میں بٹ گئے۔ سیاسیات میں مسلمان صریحاً انگریز کے ساتھ تھے۔ اگرچہ ان میں مذہبی جوش کچھ زیادہ باقی نہ رہا تھا تاہم وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اپنے آپ کو ایک علیحدہ وجود سمجھنے لگے مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ حکومت کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی بھی موجودہ تلخ تعلقات کی ذمہ دار ہے لیکن مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف جذبات زیادہ تر اس بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔ کہ آریہ سماجیوں نے اسلام پر سخت ترین حملے کئے۔ ہندوستان کے مسلمان اگرچہ نام کے مسلمان ہیں لیکن پھر بھی ان میں اسلامی حمیت و غیرت تھوڑی بہت موجود ہے۔ آریہ سماجیوں نے شمالی ہند کے طول و عرض میں اسلام کے خلاف شدید ترین اور اوچھے حملے شروع کر دیئے۔ مسلمان امراء اس سے سخت بھنائے! اور مسلم عوام میں نادانستہ طور پر ملی عزت و ناموس کا سوال پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا

کہ اگرچہ مسلم عوام کو اسلام کے متعلق بہت کم علم تھا لیکن وہ ہندوؤں کے خلاف ہو گئے اور ملک کے جن حصوں میں آریہ سماجیوں کا زور تھا وہاں کے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف منافرت پیدا ہو گئی۔ جن موحدین نے آریہ سماجی پرچار کے خلاف جہاد کیا۔ وہ تہ دل سے اس پرچار کے ممنون تھے۔ کیونکہ اس پرچار نے انہیں اس بات کا موقعہ مہیا کر دیا کہ اگر وہ مسلم عوام میں تسلی بخش مذہبی اصلاح نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم اتنا تو بہ آسانی ہو سکتا ہے کہ مسلم عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اپنی حمایت میں کر لیں سماجیوں نے "ہندو خطرہ میں" کا نعرہ بلند کیا۔ حالانکہ اس وقت ہندو دھرم اسلام پر غلبہ حاصل کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ حوصلہ ہار چکے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے۔ سناتن دھرم کی بنیاد ویدانت پر ہے۔ اس لئے یہ ایک وسیع مذہب ہے۔ اسلام اس مذہب میں مدغم ہونے والا تھا کہ آریہ سماج نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو بالکل مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ سماجی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں میں اصلاح کی۔ اور انہیں مسلمان اور عیسائی ہونے سے بچایا لیکن خود آریہ سماج کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اسلام کا ہندی ایڈیشن ہے جس نے ہندوؤں کی ہر متبرک چیز کے خلاف بغاوت کی ہے۔ یہ تو اس کا مذہبی پہلو ہے۔ اس نے ہندوؤں کو اسلام سے بچانے کی کوشش بعد از وقت شروع کی۔ اور یہ کوشش روحانی پہلو سے عاری تھی جس وقت سوامی دیانند نے ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے بچانے کا سوچا۔ اس وقت خود اسلام کی حالت ہندوستان میں بہت دگرگوں ہو رہی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ سوامی جی نے چند اشخاص ایسے دیکھے ہوں جو تھوڑے سے ہندوؤں کو اسلام کی تبلیغ کر رہے ہوں لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ خود اسلام ہندومت میں مدغم ہو رہا ہے اور اپنے وجود کو ختم کر رہا ہے۔ جو لوگ ہندو دھرم کی جذب کر لینے کی قوت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ احمق ہیں۔ سناتن دھرم ظاہر میں غیر جذباتی سا مذہب دکھائی دیتا ہے لیکن یہ زبردست قوت کا مالک ہے۔ ہندومت بودھوں اور جینیوں کی طرح تمام مسلمانوں کو بھی اپنے میں

جذب کرنے ہی والا تھا کہ سماجیوں کی شدھی کی تحریک نے مسلمانوں کو چوکنا کر دیا مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ آریہ سماج نے تعلیمی میدان میں بہت خدمات سر انجام دی ہیں لیکن اس کی مذہبی کوششوں نے مسلمانوں کو اپنے علیحدہ وجود ہونے کا احساس دلایا اور مسلمانوں نے سیاسیات میں سخت روش اختیار کر لی۔ اور اس کے ساتھ ہی آریہ سماج تحریک کی وجہ سے ہندو اصلی ہندومت سے پرے ہو گئے۔ الغرض یہ تحریک اپنے مقاصد کے لحاظ سے ناکام رہی۔

آریہ سماج کا مذہبی فلسفہ اسلام کی اصلی تعلیمات سے ملتا جلتا ہے۔ ہندو دیوی دیوتاؤں کی مذمت کے سلسلہ میں سماجیوں کا رویہ مسلمانوں سے زیادہ سخت ہے۔ تصوف اور ویدانت کا فلسفہ بالکل ایک سا ہے۔ اور تصوف ہندوستان کے اسّی فی صدی مسلم عوام کا مذہب ہے جو عربی اسلام سے بہت دور ہو چکے ہیں لیکن اس امر کے باوجود ہمیشہ ہندو مسلم فساد ہوتے ہیں۔ اور آریوں اور سناتنیوں میں کبھی تصادم نہیں ہوتا۔ ان حقائق سے یہ ظاہر ہے کہ ہمارے اختلافات مذہبی اصولوں کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کی تہ میں کچھ اور احساسات کام کر رہے ہیں۔

اس ملک کی دوسری تحریک سکھ مت کا مطالعہ ہمیں کرنا چاہیئے۔ یہ تحریک شروع میں محض روحانی تھی، اور کوئی سیاسی پہلو نہ رکھتی تھی لیکن بعض واقعات نے اسے سیاسی اور ہر حیثیت سے مسلمانوں کے خلاف کر دیا۔ جہاں تک اس کے مذہبی فلسفہ کا تعلق ہے۔ یہ اسلام کا گورمکھی اڈیشن ہے۔ یہ توحید کی تعلیم دیتا ہے۔ شرک کا سخت مخالف ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر کا نام بھی عزت سے لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگرچہ سکھ اپنے آپ کو سیاسی طور پر ایک علیحدہ قوم سمجھتے ہیں۔ اور سماجیوں نے ان کے گوروؤں پر سخت حملے کئے ہیں لیکن جس قدر فساد ہندو مسلمانوں میں ہوتے ہیں۔ ان کا عشر عشیر بھی ہندوؤں اور سکھوں یا سماجیوں اور سکھوں کے درمیان نہیں ہوتے۔ اگرچہ سکھ مت اور اسلام میں بہت زیادہ مذہبی مشابہت ہے لیکن روزمرّہ کی زندگی میں سکھوں اور مسلمانوں

میں کسی قسم کا پیار اور صلح نہیں جب کبھی کوئی معاشری یا سیاسی مسئلہ پیدا ہوا ہے سکھوں کی ہمدردیاں صریحاً ہندوؤں کے ساتھ رہی ہیں۔ اور ہندوؤں نے علانیہ سکھوں کا ساتھ دیا ہے۔

حالانکہ ہندوستانی اسلام سناتن دھرم کا عربی ترجمہ ہے۔ اور سکھ مت اور آریہ سماج تحریک اصلی اسلام کے گورمکھی اور ہندی ایڈیشن ہیں۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھر بھی مخاصمت موجود ہے۔ اور سکھ اور سماجی ہمیشہ ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں جب میں ان حقائق پر نظر ڈالتا ہوں تو میرا ذہن یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں۔ اور ہمیں ملک کی موجودہ حالت کے اصلی اسباب تلاش کرنے چاہئیں۔

یہ غلط نظریہ عام ہو چکا ہے کہ صرف صوفی ہی دوسروں کے ساتھ رواداری برتتے ہیں۔ اور مذہبی ملّا بہت زیادہ متعصب ہوتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی انکار نہیں کہ ملّا قدامت پسند ہے لیکن تمام مسلمان اس شخص کے سخت مخالف ہیں جو دوسروں پر کسی قسم کا ظلم کرے۔ کافر کوئی مکروہ اصطلاح نہیں۔ یہ غیر مسلمانوں کو مسلمانوں سے تمیز کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ کافر کے معنی خدا کو نہ ماننے والا ہے۔ اگلی دنیا میں یہ اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے لیکن اس دنیا میں ان سے کوئی برا سلوک نہیں کیا جاتا۔ اسلام کافروں کو بھیڑیوں کے سامنے نہیں پھینک دیتا بلکہ ان کی حفاظت کرتا ہے ملّا کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ سخت اور غیر روادارانہ ہوتا ہے لیکن کافروں کے ساتھ اس کا سلوک ہمدردانہ ہوتا ہے۔ اپنی قوم میں اس کی حیثیت پولیس افسر کی ہے۔ کہ ہر کوئی اس سے ڈرے لیکن غیر مسلموں کے لئے وہ محبت و اُلفت کا علمبردار ہے۔ وسیع المشرب مسلمان اسے ایک تند خو دیو سمجھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک خنداں مزاج دیوتا ہے۔ جو دوسروں اور بالخصوص کافروں کی ہمیشہ بھلائی چاہتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے اس خیال پر ایک ہندو حیران رہ جائے گا کیونکہ اس نے ملّا کی حمایت

میں کبھی کچھ نہیں سنا مگر میرے پاس اپنے خیال کی تائید میں ٹھوس حقائق ہیں۔ جمعیتہ العلماء صرف مذہبی علماء کی جماعت ہے۔ یہ جماعت ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ اور کانگرسیوں کے اعمال کے تضاد اور ان کی متلون مزاجیوں کو ہمیشہ صحیح ثابت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انہیں ہندوؤں کا اجیر سمجھا جانے لگا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کون ہیں؟ ایک بہت بڑی شہرت کے مالک مذہبی عالم۔ ان کی مذہبیت نے انہیں نہ صرف عملی سیاسیات میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا ہے بلکہ کانگرس اور ہندوؤں پر مسلمانوں کی طرف سے جو سخت حملے کئے جاتے ہیں وہ ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک دوسری جماعت مجلس احرار ہے۔ یہ غریبوں کی جماعت ہے۔ اس کی قیادت مذہب کے شیدائیوں کے ہاتھ میں ہے جو ہندوؤں سے زیادہ ہمدردانہ سلوک کرتے ہیں۔ اور غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ بردباری برتنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ مسلمان جماعتیں جن کی تہ میں مذہب کام نہیں کر رہا۔ وہ نہ صرف کبھی کبھی بلکہ ہمیشہ ہندوؤں اور کانگرس کے خلاف صف آرا رہتی ہیں۔ کیا ان حقائق کی موجودگی میں ملا کے متعلق ہماری رائے تبدیل نہیں ہونی چاہیئے؟ اور کیا ان کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے موجودہ اختلافات کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں؟

ایک اور حقیقت پر بھی نظر ڈالیئے مسلمانوں کی دو یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک علی گڑھ میں دوسری دیوبند میں۔ اول الذکر میں دنیوی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور ثانی الذکر میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ علیگڑھ کے طلبہ کی ذہنیت تقریباً ہمیشہ ہی برطانیہ کی حامی اور ہندو کی مخالف رہی ہے۔ مگر دیوبند کے علماء برطانیہ کے مخالف اور کانگرس کے حامی ہیں۔ مسلم لیگ کی رہنمائی علی گڑھ اور انگریزی یونیورسٹیوں کے سند یافتوں کے ہاتھ میں ہے جمعیتہ العلماء کے ارکان کے مقابلہ میں انہیں اسلام کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اگر ہمارے اختلافات مذہب کی بنا پر ہوتے تو جمعیتہ العلماء اور مجلس احرار کانگرس اور ہندوؤں کی مسلم لیگ سے بھی زیادہ مخالفت کرتیں۔ اور اگر موجودہ پیچیدگیاں اور کشمکشیں تھوڑا سا بھی مذہب

کی بناء پر ہوتیں تو مسلمانوں کی قیادت مسٹر جناح کے ہاتھ میں نہ ہوتی جو ایک لائق قانون دان اور بہترین سیاس ہیں لیکن یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ مذہبی معلومات کے لحاظ سے وہ ہر مسلمان سے پیچھے ہیں۔

چھوت

ایک سیدھا سادھا اور صلح کل ہندو جو مذہب کے معاملے میں نہایت فراخ دل ہے جب معاشرتی میدان میں داخل ہوتا ہے تو فوراً ہی اس کی حالت تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ فوراً چولی بدلتا ہے۔ اور اگر آپ اس کے قریب جانے کی جرأت کریں تو دانت دکھانے لگتا ہے اگر شہزادوں جیسے لباس میں ملبوس کوئی مسلمان سرمایہ دار کسی ہندو حلوائی کے ہاں مٹھائی خریدنے کے لئے جاتا ہے تو اُسے بھی دوکاندار سے کسی قدر فاصلے پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ اس کی گھرکیاں سہنا پڑتی ہیں کیا کوئی مسلمان قیمت ادا کرتے وقت ہندو حلوائی کے ہاتھ کو چھونے کی جرأت کر سکتا ہے؟ نہیں۔ اُسے مٹھائی لینے کے لئے اپنے ہاتھ آگے بڑھانے پڑتے ہیں۔ اور حلوائی کسی قدر بلندی سے اس کی طرف مٹھائی پھینکتا ہے تاکہ مسلمان کے ہاتھوں سے چھو کر اس کا جسم پلید نہ ہو جائے۔ ایک ہندو یوں تو ہر لحاظ سے نہایت شریف انسان ہے لیکن معاشرتی میدان میں اس کی تنگدلی کو مسلمان قوم بہت

محسوس کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوؤں نے نفرت کی بنا پر یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا یہ رویہ ان کے سماجی نظام کا ایک نتیجہ ہے۔ اور یہ بات ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتی کہ کسی کو اس پر اعتراض ہوگا۔ مسلمانوں میں بعض گروہ ایسے موجود ہیں جو اس تمیز کو محسوس کرتے ہیں۔ اور کھلم کھلا کہتے ہیں کہ ہندو ان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہر قدم پر ان کی عزت نفس کی تباہی کے لئے کوشاں ہیں جو اس سلسلہ میں مجھ سے مختلف رائے رکھتے ہیں میں اُن سے یہ کہوں گا کہ ہم ہندو کے مقاصد کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھتے ہیں لیکن مسلمانوں پر اس سلوک کا کیا اثر ہوگا۔ اس کے متعلق مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو ایسے سلوک کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتا اس میں اپنی عزت نفس کا جذبہ بالکل مردہ ہے اور جن کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا ہے ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ گاہے بگاہے میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ میرا خاکروب میرے ساتھ کھانا کھا لے لیکن چونکہ ہریجنوں میں جماعتی طور پر احساسِ کمتری پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے وہ اس وقت تک ایسا کرنے پر تیار نہیں ہوتے جب تک ان کو اس کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ اور دھمکایا نہ جائے۔ ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ میں نے ایک ہریجن قیدی کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کو کہا۔ لیکن یہ سنتے ہی وہ بھاگ گیا۔ اور جا کر ٹٹی میں چھپ گیا۔ اس پر دو دیگر قیدی اُسے ٹٹی سے باہر کھینچ لائے۔ اور میرے قریب ایک رضائی پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ دھوئے گئے اور اُسے ایک چمچہ دے دیا گیا۔ وہ اس وقت سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا جیسے اُسے عرصہ سے تپ لرزہ ہو گیا ہو۔ میں اس وقت کھچڑی کھا رہا تھا۔ اُس نے ایک چمچہ بھرا اور اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر چاولوں کو منہ میں ڈالا کہ کہیں چمچہ اس کے ہونٹوں کو نہ چھو جائے۔ اُسے میرے بالمقابل بیٹھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ چنانچہ اس نے میری طرف پشت کر لی۔ اور زمین پر نظریں گاڑ دیں۔ جیسے کسی بہت پرانے

خیال کے ہندو گھرانے کی کوئی دلہن اپنے خاوند کے سامنے بیٹھی ہوئی "گنونا" کی رسم ادا کر رہی ہو دو
تین لقمے کھانے کے بعد پھر ٹٹی میں پناہ لینے کے لئے اٹھ بھاگا۔ میرے ساتھ کھانا کھانا اس کے لئے
ایک شدید آزمائش کی گھڑی بن گیا تھا۔ اس نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک دوست
کو بتایا کہ یہ پانچ منٹ جو اسے میرے سامنے گزارنا پڑے۔ اس کے لئے آزمائش کے پانچ سال
بن گئے تھے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے کس طرح ان سے زندگی چھین لی ہے اور
ان کی عزتِ نفس کو کچل ڈالا ہے۔ اور اب وہ بڑے امور کے لئے اپنے دل میں ہلکی سی دھڑکن بھی محسوس
نہیں کر سکتے۔ وہ جنگِ آزادی کے صحیح منشاء و مطلب کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا مسلمان اچھوتوں کے
ساتھ نفرت کی وجہ سے برا سلوک کرتے ہیں؟ نہیں! ہندو اور مسلمان، دونوں نہایت معصومیت
سے ہمارے ملکی اچھوتوں کو زہر بھرا ڈنک مارتے ہیں۔ ایک سانپ تو انسان کی جان لے سکتا ہے
لیکن ہم نے اچھوتوں کو انسانیت سے بھی محروم کر رکھا ہے۔ ایک شیر بغیر کسی ندامت کے وحشی
جانوروں پر حملہ کرتا ہے اسی طرح ہم اس بات پہ کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں کرتے کہ ہم
اچھوتوں کے ساتھ کتنا ظالمانہ سلوک کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے میں ہمارے
برے ارادوں کو دخل نہیں ہوتا۔ تاہم ان کو ہم ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس وقت تک
ہمارے دل میں اچھوتوں کیلئے درد پیدا نہیں ہوگا جب تک خدا اچھوتوں میں کوئی ایسا رہنما پیدا نہیں کرتا جو نہایت
جرأت سے کام لیکر موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کرے۔ اور لوگوں کو نیچا دکھانے کیلئے اچھوتوں کو منظم کرکے
جو دولت، ذات پات، پیشے اور عقائد کی بنا پر انسان اور انسان میں نامناسب امتیاز روا رکھتے ہیں ایسا
لیڈر نہایت حیرت انگیز انسان ہوگا جو ہریجنوں کو ہندوستانی قوم کا ایک ضروری جزو کہنے کی جرأت
کرے گا۔ جب تک ہم اپنے سماجی نظام اور رسوم سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے اور ہریجنوں کے
ساتھ اپنے بھائی بندوں جیسا سلوک روا نہیں رکھتے۔ اس وقت تک ہم اپنے قومی مستقبل کو

درخشاں نہیں بنا سکتے۔ اگر جغرافیائی اور سیاسی حالات کی یکسانیت قوم کی تشکیل کرتی ہے تو بلا شبہ ہم ہندوستانی ایک قوم ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ۱۸۵۷ء سے مختلف گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اور اگرچہ ایک دوسرے میں مدغم ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں لیکن ایک دوسرے کو غلام بنانے کے لئے راضی ضرور ہیں چھوت چھات ہمارے افتراق اور ہماری کمزوری کی پہلی اور بنیادی وجہ ہے بعض خوش فہم لوگوں کا خیال ہے کہ انقلاب کے ایک جھٹکے سے ہی یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن ہندوستان روایات میں اتنا زیادہ دبا ہوا ہے کہ کسی سیاسی انقلاب کا تحمل نہیں ہو سکے گا یہاں صرف وہی سماجی انقلاب لوگوں کی حالت کو سدھار سکتا ہے جس کی بنیادیں لازمی طور پر اقتصادی انصاف پر استوار ہوں میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ بہت عرصہ تک مستقبل میں بھی ہندوستان کی حیثیت ایک نفاق زدہ گھر کی سی رہے گی اسلام مساوات و اخوت کی سب سے بڑی تحریک تھا لیکن اسے ہندوستان میں اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامی ہوئی۔ اور مسلمان بھی ذات پات میں کھو گئے۔ ہندوستان کا پرانا نظام حیات نہ صرف اسلام کی آمد کے بعد زندہ رہا ہے بلکہ جدید مغربی خیالات بھی اس پر کچھ اثر نہیں کر سکے ہندوستان میں برطانی حکومت کی آمد سے ہندوستانیوں نے سماجی نظام میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں دیکھی بعض فراخ دل ہندوؤں کی کوششیں بھی عوام کی ذہنیت میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہ کر سکیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے قبل یہاں سر پھٹول نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کے لئے موقعہ ہی نہیں تھا مسلمان ہندوستان پر اپنے حملے کے زمانے سے لے کر کانگرس کے زمانے تک اچھوتوں کا سا سلوک برداشت کرتے چلے آتے وہ ایک ہزار سال تک ایک دشمن ملک میں قابض فوج کی حیثیت میں رہے۔ اس سے ان کو سیاسی اقتدار

اور وقار حاصل ہوا۔ ہندو مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں اور مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ایک ماتحت قوم جیسا سلوک کرتے رہے۔ اور دونوں اپنے اپنے سماج میں مطمئن اور پُرسکون زندگی گزارتے رہے۔ اس وقت ایک قوم بننے کا تخیّل ان کے دلوں سے یکسر غائب تھا۔ راجپوت راجے اور مغل شاہنشاہ سیاسی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرتے رہے لیکن اس وقت بھی ہندو مسلمان ایک قوم نہ بن سکے۔ اکبر نے بہت بڑے صوفی کی طرح مذہب کی سرحدیں بہت وسیع کر دیں لیکن مذہب کی یہ وسعت بھی خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کر سکی۔ سیاست صرف اعلیٰ طبقات تک محدود تھی۔ اگرچہ یہ طبقے آپس میں صلح سے رہتے تھے لیکن عوام ایک دوسرے کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔ چھوت چھات نے ابھی تک ان کو مختلف مخالف گروہوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک نفرت کی وجہ سے نہیں کیا جاتا تھا بلکہ چھوت چھات بہت پرانے زمانے سے ہندوستانی زندگی کا ایک حصّہ تھی اور مسلمانوں کی آمد کے وقت کوئی ہندو موجود نہ تھا جو ہندو سماج میں مسلمانوں کو پانچویں ذات بنا دیتا۔ برہمنوں کو برہما اپنے منہ کشتریوں کو اپنے بازو۔ ویشوں کو اپنی رانوں اور شودروں کو اپنے پاؤں سے پیدا کر چکے تھے اب جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں رہتا تھا جو مسلمانوں کے لئے مخصوص کیا جاتا جو لوگ کسی بھی ذات سے متعلق نہ تھے۔ وہ شودروں میں ملائے گئے۔ مفتوح اور ملیچھ (مسلمانوں) کو ایک ہی جماعت تصور کیا گیا۔ کیونکہ وہ کسی اور جماعت کا تصور بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے تھے مسلمانوں نے ہندوؤں کے سوشل نظام میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی۔ اور ان کے ہاتھوں سے صرف سیاسی طاقت چھیننے پر ہی اکتفا کر لیا۔ خاندان مغلیہ کی تباہی کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور سیاسی اقتدار اور وقار کے چھن جانے کے بعد چھوت چھات ہی ہندوستان میں

اسلام کی یادگار رہ گئی۔ اگرچہ مسلمان صدیوں تک ہندوؤں کے دوش بدوش زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن اتنے طویل عرصہ کا میل ملاپ دونوں قوموں کو آپس میں ملانے میں ناکام رہا۔ حکومت کھو دینے کے بعد مسلمانوں نے اچانک محسوس کیا۔ کہ وہ سماجی سیڑھی کے آخری زینے پر کھڑے ہیں۔ حکومت کا چلا جانا مسلمانوں کے لئے کوئی مالی نقصان نہ تھا کیونکہ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ اور ملکی نظام میں عوام کی کوئی آواز بھی نہ تھی۔ بہر حال ان سے وقار اور سربلندی چھن گئی۔ اور وہ شہنشاہ کا ہم مذہب ہونے کی مسرت سے بھی محروم ہو گئے۔

عیسائی حکومت کے کچھ سالوں تک مسلمان ہندوؤں کے اچھوت اور انگریزوں کے غلام بننے پر ہی مطمئن رہے۔ دراصل ان میں کوئی طاقت اور قوت نہ رہی تھی۔ انگریزی حکومت کے نئے نظام نے ہندوؤں کے فہیم طبقہ میں نئی روح پھونک دی۔ انہوں نے مغرب سے نئے خیالات حاصل کئے۔ اگرچہ انگریزی حکومت کی بنیاد بھی مغلوں کی شخصی حکومت کے کھنڈرات پر رکھی گئی تھی لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اس حکومت کا پس منظر ضرور جمہوری تھا۔ اور اس میں ایک عام آدمی کے حقوق شہریت کو بھی تسلیم کیا گیا تھا اس بات کے باوجود کہ ہر کلکٹر اور ڈپٹی کمشنر چھوٹے پیمانے پر مغل شہنشاہ ہوا کرتا تھا لیکن انفرادی آزادی کے احترام کا جذبہ حکومت میں موجود تھا۔ ہندوؤں نے اس نئے دور کا استقبال کیا۔ اور وسیع القلب انگریزوں کی مدد سے عوام کو زیادہ حقوق دلانے کی غرض سے انڈین نیشنل کانگریس قائم کی۔ اگرچہ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے اس نئے دور کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ لیکن اعلیٰ طبقوں نے جلد ہی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر دیا۔ عوام کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب یہ تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ انہوں نے خیال کیا کہ قسمت نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ چنانچہ کانگریس کی لگاتار اور مسلسل جدوجہد سے تاریخ میں پہلی بار ہندوستانیوں کو اپنے وجود کا احساس ہوا لیکن مسلمان عوام ابھی تک پریشانی کی حالت

میں تھے۔ چنانچہ حکومت نے کانگریس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اونچے طبقے کو قابو کرنا شروع کیا۔ اور آریہ سماج نے علماء کے طبقہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے دونوں طبقوں نے عوام کو بیدار کرنا شروع کیا۔ مسلمان عوام نے سیاسیات میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کی۔

"مذہب خطرے میں ہے" کے نعرہ کا بھی ان کے نزدیک کوئی مطلب نہ رکھتا تھا کیونکہ ہندو دھرم اور ہندوستانی اسلام میں کم و بیش کوئی فرق نہ تھا۔ بہرحال ہندوؤں کے معاشری سلوک نے مسلمانوں کو بہت زیادہ ناراض کر دیا۔ اگرچہ یہ سلوک کوئی نئی بات نہ تھی، تاہم انفرادی آزادی کے دور سے مسلمان عوام کسی حد تک بیدار ہو گئے۔ وہ سو گئے تھے لیکن مرے نہیں تھے۔ سیاسی میدان میں برطانیہ اور مذہبی میدان میں آریہ سماج نے مسلم عوام کے دل میں ہندوؤں کے خلاف جذبات پیدا کر دیئے۔ فہیم اور راسخ الاعتقاد مسلمانوں نے یہ جذبات پیدا کرنے میں ———— بہت زیادہ حصہ لیا۔ ہندو ان مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھوتوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ جو آریہ نسل یا اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے یا عوامی مشرب یا تعلیم یافتہ تھے۔ آپ پکے قوم پرست یا گاندھی جی کے پختہ پیرو کار بھی ہو جائیں لیکن جونہی آپ ایک ہندو کو یہ بتائیں گے کہ آپ مسلمان ہیں۔ فوراً آپ کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ ہندو مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے میں اپنے آپ کو سچا اور بے گناہ ثابت کرنے کی کتنی ہی کوشش کریں، وہ مسلمانوں کو اس بات کے لئے مطعون نہیں کر سکتے۔ کہ ان کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف منافرت کے جذبات کارفرما ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہندو کا دل تبدیل ہو جائے کیونکہ اس کا دل ناپاک نہیں ہے۔ اور ان کی بہت بڑی اکثریت بغیر کسی بری نیت کے مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے لیکن یہ صورت حال اس بات کی صحیح طور پر مظہر ہے کہ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں۔ اور مسٹر جناح علیحدگی کا علم بلند کرنے میں حق بجانب ہیں۔

اس سلسلہ میں میرا اپنا واقعہ بھی اس مضمون پر روشنی ڈالے گا اور سبق کا باعث ہوگا۔ بچپن کی بات ہے کہ میری ماں نے مجھے بازار سے دہی لانے کو کہا۔ میں نے اس خیال سے کہ ہوشیار سمجھا جاؤں۔ اپنی قریبی دکان سے دہی نہ خریدی اور کسی قدر دور چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سے تازہ دہی بھی ملے گی۔ اور میری والدہ خوش ہوں گی۔ ان دنوں سارے امرتسر میں کوئی مسلمان حلوائی نہ تھا۔ اور ہندو سکھ حلوائی اس خیال سے کہ مسلمانوں کے ہاتھ لگانے سے وہ پلید نہ ہو جائیں مسلمان خریداروں سے اپنے ہاتھ سے پیسے بھی نہ لیتے تھے۔ اس غرض کے لئے وہ ایک لکڑی کی ڈوئی کا استعمال کیا کرتے۔ اس کا دستہ حلوائی خود تھام لیتا۔ اور مسلمان سے کہتا۔ وہ اس کے پیالہ میں پیسے ڈال دے۔ یہ لکڑی کی ڈوئی اس واسطے استعمال کی جاتی تھی کیونکہ ہندو کا خیال تھا کہ مسلمان کی چھوئی ہوئی لکڑی کو ہاتھ لگانے سے وہ بھرشٹ نہیں ہوتا۔ اور اس طرح ہندو دکاندار پلید ہونے سے بچ جاتا تھا۔ جب میں اس ڈوئی کے پیالہ میں پیسے ڈال رہا تھا۔ بدقسمتی سے اسے میرا ہاتھ لگ گیا۔ اس سے دکاندار آگ بھبھوکا ہو گیا اور اس نے ایک ہی سانس میں مجھے ہزاروں گالیاں سنا ڈالیں۔ ایک ساعت کے لئے میں بالکل بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ازاں بعد وہاں سے چلا آیا۔ اور زندگی کے کئی سالوں تک بعد میں کسی ہندو یا سکھ کی دکان پر نہ گیا۔ میری زندگی کا یہ واقعہ جس نے میری زندگی کے معاشری پہلو کو بالکل تبدیل کر دیا۔ اس وقت رونما ہوا جب ملک میں کوئی بھی سیاسی یا سماجی تحریک نہیں تھی۔ اور مسلمان روزمرہ ایسی ذلتیں برداشت کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندو دکانداروں کا مقاطعہ کرنے کی پہلی موثر آواز گجرات (پنجاب) میں اٹھائی گئی۔ ان دنوں پیسہ اخبار مسلمانوں کا واحد ہفتہ وار اخبار تھا۔ اس نے اس تحریک کو ہوا دی۔ اور یہ آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس پیغام کا خیر مقدم کرنے کے لئے ہمہ تن تیار تھے۔ کیونکہ مسلمان عوام اور امراء دونوں ہی کو ہندوؤں کے سلوک کا دردناک تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی دکانیں کھل

گئیں لیکن کسی تعمیری پروگرام کی کامیابی کے لئے اقتصادی خوشحالی ضروری ہے۔ اور مسلمان کے پاس یہ چیز نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اور ۹۰ فیصدی دکانیں بند ہو گئیں۔ قدیم زمانے کی پرانی روایات نے ہندوؤں کو بہت زیادہ قدامت پسند بنا دیا ہے اسلئے وہ کسی دباؤ سے متاثر ہو کر تبدیل نہیں ہو سکتے۔ ہندو رہنماؤں نے تمام اہم مسائل کے متعلق بھی ابھی تک نہایت مبہم سا رویہ اختیار کئے رکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گجرات کے جوابی مقاطعہ کی تحریک کے بعد کئی دیگر منظم تحریکیں بھی اس کے بعد شروع کی گئیں۔

بعض مسلمانوں نے اپنے آپ کو ہندو کے معاشری مظالم سے بچانے کی کوشش میں بدنصیبی سے ہندو دشمنی اپنے دلوں میں پیدا کر لی ہے۔ مسلمانوں نے چھوت چھات کو دور کرنے کے سلسلہ میں کوئی زیادہ تغیر اقدام نہیں کیا۔ بلکہ وہ اس راستہ پر چیونٹی کی چال رینگتے رہے ہیں۔ اس تحریک سے مسلمانوں کو صرف اتنا فائدہ ہی ہوا۔ کہ بعض مسلمانوں کی دکانیں کھل گئیں لیکن سیاست پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔

عوام ایک سیاسی اور سماجی کام میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔ اگر ایک بار ان کے دل کا سکون تباہ ہو جائے تو ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اور وہ غصے کی حالت میں اپنے مفاد قربان کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ قوم پرست لیڈروں کی ناکامی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ میں نے خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سیاسی لیکچر سنے ہیں۔ وہ اپنے مخالفین تک کو اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔ تقریر کے دوران میں عوام ان کی تقریر سے اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بھی بہنے لگتے ہیں۔ اور وہ اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کے زیر اثر اچھل اچھل پڑتے ہیں جب یہ سحر بیان مقرر کہتا ہے کہ "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اور یہ مسلمانوں کو ہر قیمت پر حاصل کرنی چاہیئے" تو لوگ یکزبان ہو کر "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے۔ کہ

یہ آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر حاصل نہ ہوگی"۔ تو مسلمان حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ "اتحاد! اور ان کے ساتھ جو ہم سے اچھوتوں کا سلوک کرتے ہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے"

ایک مسلمان قوم پرست اپنی قربانیوں کے باوجود انتخاب میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ ایک عامی مسلمان کی نگاہ میں ملکی آزادی کے سلسلہ میں قومی خدمات ہندوؤں کی وفادارانہ خدمت کرنے کے مترادف ہے۔ قوم پرست مسلمان عوام کو سیاست کے میدان میں بھگوڑی ہونے کا الزام دیتا ہے۔ اور ایک عام مسلمان قوم پرست کے متعلق یہ خیال کرتا ہے۔ کہ وہ اسے ہندو کے اوتار گاندھی جی کے قدموں میں قربان کردینا چاہتا ہے۔ میں کئی ایسے مخلص مسلمانوں سے آشنا ہوں جو بہت شوق سے آزادی کی جنگ میں شامل ہوئے لیکن دل شکستہ ہوکر واپس آگئے کیونکہ مسلمان عوام کی حالت نہایت پریشان کن تھی۔ مگر اس عقدہ کے حل کی کلید ہندوؤں کے معاشرتی سلوک میں ہے۔ تحریکِ خلافت کی ابتدا میں مسلمان بہت زیادہ تعداد میں قید ہوئے۔ کم از کم پنجاب کے جیلوں کی سی کلاس میں محبوس مسلمان کارکنوں کے لئے صورتِ حال بہت زیادہ ناقابلِ برداشت تھی کیونکہ ہندو، سکھ قیدی مطبخوں کے منتظم تھے اور کسی مسلمان کو باورچی خانہ کی دہلیز سے گزرنے کی جرأت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ بات صرف یہیں پر ہی ختم نہیں ہوجاتی تھی بلکہ مسلمانوں کو کہا جاتا تھا۔ کہ وہ کسی قدر دور کھڑے رہیں۔ اور ہندو اور سکھ قیدی ان کی طرف روٹی پھینک دیتے تھے۔ پھر مسلمان اس پر اپنے لوہے کے پیالے ایک قطار میں رکھ کر خود علیحدہ ہوجاتے۔ اگر پیالہ مسلمان کے ہاتھ میں ہوتا تھا تو کوئی غیر مسلم باورچی ان میں سبزی یا دال نہیں ڈالتا تھا کیونکہ اس طرح اس کے پلید ہونے کا خطرہ تھا۔ لیکن سی کلاس کے ہندو قیدیوں کو اس سے مستثنےٰ رکھا جاتا تھا۔ سی کلاس کے بعض سرکردہ مسلمان ورکروں نے اس رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر بھوک ہڑتال بھی کی۔ اس امتیازی سلوک کا ان پر اتنا بُرا اثر پڑا۔ کہ جہاں تک ہندوؤں کے

سلوک کا تعلق ہے انھوں نے اس وقت اپنا نصب العین "جیسے کو تیسا" بنا لیا ہے۔

اس تحریک کا فوری اثر یہ ہوا کہ حکومت نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مٹکوں کا انتظام کر دیا۔ یہ نہایت حیران کن بات ہے کہ جب بھی کوئی سماجی یا تجارتی تحریک شروع کی گئی۔ اس کا انجام ہندو دکانوں کے جوابی بائیکاٹ کے نعرہ پر ہوا۔ یہ نعرہ مقابلۃً عوام کے دل پر زیادہ اثر کرتا ہے۔ مسلمان عوام یہ چاہتے ہیں کہ ہندو ان سے اچھوتوں کا سا سلوک نہ کریں۔ امر یہ ہے کہ مسلم لیگی لیڈروں کے ہمیشہ اس قسم کے ایجی ٹیشنوں سے علیحدہ ہی رہے ہیں۔ انہیں مقاطعہ کی ان تحریکات سے کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی علیحدگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے اس سلوک کا اثر محسوس نہیں کرتے تھے کیونکہ ہندو اور مسلمان سرمایہ داروں کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ ایک دوسرے کا شدید مقاطعہ نہیں کرتے۔ اور مسلمان سرمایہ دار بازاروں میں شاذ و نادر ہی جاتے ہیں۔ اس لئے وہ اس سلسلہ میں مسلمان عوام کی طرح سنجیدگی سے نہیں سوچتے۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی اپنے نوکروں کے ساتھ غلاموں اور اچھوتوں کا سلوک کرتے ہیں۔ اس لئے ہندو دکانوں کا جوابی مقاطعہ لازماً عوام کی تحریک ہے اور مسلمان عوام کی بیداری کے ساتھ ساتھ اسے بھی طاقت اور زور حاصل ہوگا جب تک ہندو لیڈر ہندو عوام پر اپنا اثر نہیں ڈالیں گے ہندو مسلم اتحاد ایک خواب بنا رہے گا۔

مسلمان عوام کو سیاست کے ساتھ بہت کم لگاؤ ہے۔ وہ سیاست دان نہیں ہیں کہ ملک کی بہتری پر نظر رکھیں۔ ان کا طرزِ استدلال نہایت سادہ ہے مثلاً وہ یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ہمارا ہندو ہمسایہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارے ہاتھ لگانے سے ہی وہ پلید ہو جاتا ہے۔ اُسے ایسا محسوس کرنے کا کیا حق ہے؟ اور اگر اُسے یہ حق حاصل ہے تو ہم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیوں نہ کریں۔" ان کے تخیل کی منتہی یہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ چاہتا ہے کہ "مجھے نہ چھو" کا جذبہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہے کیونکہ اس طرح ہندوؤں میں احساسِ برتری اور مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا

ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب صورتِ حالات کا تنگ نظری سے مطالعہ کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام نسلی اور قبائلی تفاخر کی ہستی اڑاتا ہے لیکن ہندوؤں کے نظریہ کا جواب دینے کے لئے مسلمان عمداً ایک نئے قسم کا تفاخر پیدا کر رہے ہیں۔ جو مذہبی عتبار سے غلط خیال پر مبنی ہے۔ اور ملک کے امن کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہندو اعتقادات اپناتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندو کافر ہیں۔ اس لئے وہ پلید ہیں۔ لہٰذا ان کے چھونے سے مسلمان جو جسمانی اور روحانی طور پر پاک ہیں پلید ہو جائیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی رو سے تمام بنی نوع انسان پاک ہیں۔ اور اسلام کا مذہبی نظام نسل، و نسب اور طبقہ کے امتیاز ذات پر مبنی نہیں ہے لیکن مسلمان اپنی قوم کو متاثر کرنے کے لئے مذہب کو استعمال کر رہے ہیں کیونکہ مذہبی نفرت ایک بہت بڑی طاقت ہے اور اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ دفاعی حیثیت اختیار کرنے اور کوئی تعمیری پروگرام سامنے رکھنے کے بجائے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے۔ اور مقاطعہ کی تحریک ہندو مسلم فسادات پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مسلمانوں کی تحریک مقاطعہ ہمیشہ عوام کی تحریک ہوا کرتی ہے۔ اور چونکہ اسے سرمایہ دار طبقہ کی امداد حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ ناکام ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ کوئی بھی تحریک ہو سرمایہ کے بغیر اس کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے رُوح کے بغیر جسم۔

ایک دن راولپنڈی جیل میں سردار بھگت سنگھ کے بھائی سردار کلبیر سنگھ نے جو وہاں میرے ساتھ تھے اور ایک نوجوان سوشلسٹ ہیں۔ مجھ سے نہایت بیباکی سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ جونہی کسی علاقہ میں احرار کا اثر بڑھتا ہے وہاں ہندوؤں کی دکانیں بند ہونے لگتی ہیں، اور مسلمانوں کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ اور بائیکاٹ کی تحریک مضبوط ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ جواب دیا کہ جب آپ کسی فرقہ کو سیاسی طور پر ترقی دلانا چاہتے ہوں۔ تو اس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس فرقہ کی تمام ذہنیت میں انقلاب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اس کو زندگی کے مختلف شعبوں کا مطالعہ کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں گویا آپ ان سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے میں اپنی عزت کا نیا احساس پیدا کریں۔ آپ کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ ذلت کو محسوس کریں۔ اور اپنے اردگرد کی اقتصادی تکالیف کا جائزہ لیں۔ ہم اپنی تقریریں اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور غیر ملکی غلامی تک محدود رکھتے ہیں۔ اور لوگ ان کے متعلق بہت حساس ہو جاتے ہیں لیکن جب وہ حالات کا ہماری تقریروں کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ تو ان کو پتہ چلتا ہے۔ کہ اس سلسلہ میں ہندو بدیسیوں سے بھی زیادہ ظالم واقع ہوا ہے۔ ایک مسلمان نے خواہ کتنے ہی صاف کپڑے کیوں نہ پہنے ہوں۔ اور وہ کتنا ہی پاک وصاف کیوں نہ ہو لیکن اس کے صرف ہاتھ لگانے سے ہی ہندو بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں تو صرف سایہ ہی اعلیٰ ذات کے ہندو کو پلید کر دیتا ہے۔ چونکہ مسلمان کو اب اپنے وقار کا نیا احساس ہو چکا ہے اس لئے وہ پہلے سے زیادہ اس ذلت کو محسوس کرتا ہے۔ اور اس طرح معاشری کرۂ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے۔

میری یہ تصریحات وزنی ثابت ہوئیں۔ اور وہ ان سے متاثر نظر آیا۔ اس نے کہا کہ ہندو بذاتِ خود اس سماجی لعنت کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق اپنے اثرات نہایت صاف گوئی سے اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اور کہا کہ چھوت چھات کے خلاف یہ پرچار محض ایک سیاسی حربہ ہے اور دل کی تبدیلی کا مظہر نہیں۔ ہندو مذہب کی بنیاد ذاتوں کے نظام پر ہے۔ سوسائٹی کا یہ پیچیدہ نظام اپنی جگہ سے جنبش اور ترقی نہیں کر سکتا۔ اور بعض مخصوص جماعتوں، ذاتوں کو کسی قسم کی مراعات دینے سے ہمیشہ منکر رہے گا۔ ہندو ایک فرد کی حیثیت میں نہ صرف بے ضرر بلکہ شرافت کا پتلا ہے لیکن جب ذات پات کے اعتبار سے اسے دیکھا جائے تو وہ ایک دخانی بیلن ہے جو آہستہ آہستہ چلتا ہے تاکہ جو کچھ اس کے راستے میں آئے اُسے کچل ڈالے۔ ہندوؤں میں بعض شریف

انسان چھوت چھات کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں لیکن یہ مستثنیات مسلمانوں کے ساتھ ہندو کا معاشرتی سلوک تبدیل نہیں کر سکیں۔ آپ اگر اس وقت مسلمان کا بہروپ بھر کر ملک کا دورہ کریں تو آپ کو مایوسی کا سامنا ہوگا لیکن آپ حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ کونسا مسئلہ قوم پرست مسلمانوں کی پریشانی اور مسلمان عوام کے رنج و غصہ کا موجب ہے۔

اس کے بعد سردار کلبیر سنگھ نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ جو ان کے ساتھ مسلمان کا بہروپ بھرنے کے بعد پیش آیا۔ اس واقعہ کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کو روزانہ اسی کا سامنا ہوتا ہے۔ دوسرے کو زیادہ دکھ پہنچانا اور ذلیل کرنا ایک اونچی ذات کے ہندو کی زندگی کا جزو ہے۔ انتقام لینا اس کے پروگرام کا حصہ نہیں ہے لیکن اس کا یہ سلوک دوسرے کے دل میں نفرت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی میں ہندوستانی مسئلہ کا حل مضمر ہے۔ اس حل کا سب سے زیادہ مایوس کن پہلو یہ ہے کہ ہندو مائیں بھی یہ جانتی ہیں۔ کہ ان کے بیٹے بیٹیاں ہزار سال کے انہی توہمات کی گود میں پل کر جوان ہوں۔ تیزی کے ساتھ تبدیل ہونے والی دنیا میں اب بھی آپ کو ایسی ہندو دیویاں نظر آئینگی جو مندروں کی طرف آتے جاتے ہوئے زاویے اور نیم دائرے بناتی ہوئی گزرتی ہیں۔ اور اس بات کی احتیاط رکھتی ہیں کہ ان کا کپڑا کسی مسلمان کے ساتھ نہ چھو جائے۔ لیکن آپ اس بات کو دھیان میں بھی نہ لائیے۔ کہ وہ مہربانی اور شفقت کی انسانی خوبیوں سے محروم ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ان خوبیوں کا پیکر ہیں لیکن دیرینہ گھریلو روایات اور ان کے سماج کے ماحول نے ان کو چھوت چھات کا شدید قائل بنا دیا ہے۔

میرے ایک سکھ دوست نے پوچھا کہ اب مسلمان روز بروز چھوت چھات کے متعلق اتنے حساس کیوں ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے آباؤ اجداد نے اس سلوک کے خلاف کبھی احتجاج نہ کیا تھا۔ میں نے اس سے ایک سوال کیا۔ جو اس کے استفسار کا مناسب جواب تھا۔ میں نے پوچھا کہ ہندوستانی ایک

صدی کے بعد سوراج کیوں چاہتے ہیں ؟ مساوی درجہ کا مطالبہ کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ سیاسی جنگِ آزادی کے رہنماؤں کو محسوس کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں اور شودروں کی معاشرتی آزادی ان کا فطری حق ہے۔ اور اس کا انکار یا التوا ملکی مفاد کے لیئے از حد مضر ہے میں نے اپنے سکھ دوست کو بتایا کہ میرے ہمسایہ میں کس طرح ایک عورت نے اپنے چھوٹے بچے کے گلے سے وہ مٹھائی نکالنے کی کوشش کی تھی جو اس نے ایک مسلمان خوانچہ والے سے خریدی تھی۔ اور قبل اس کے کہ اس کی ماں سمجھاتی۔ اس نے مٹھائی اپنے منہ میں ڈال لی تھی کئی مسلمان عورتیں اس منظر کو دیکھ رہی تھیں، بیداری کے اس زمانہ میں ایسی باتیں قوموں کے درمیان اتحاد کا راستہ تیار کرنے کے بجائے اختلافات کی خلیج کو وسیع کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔

ہندوؤں نے چھوت چھات دور کرنے کی جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں میں نے انہیں سیاسی حربہ کا نام دیا ہے۔ اور شودروں کو مسلمان بنانے کے لیئے مسلمانوں کی کوششوں کو میں سراسر منافقت کہوں گا کیونکہ اسلام کسی پیشے کو بُرا نہیں کہتا۔ اس کے قریب کسی کا بھنگی ہونا بُری بات نہیں ہے کسی مسلمان کو شودر کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کرنے سے قبل یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ اسلام قبول کرلے۔ کیا شودر اُسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "اے طبیب تم اپنا علاج کیوں نہیں کرتے اگر تم ایک سچے مسلمان ہوتے تو تم میرے ساتھ سرزمین ہند کے فرزندوں جیسا سلوک کرنے کے لیئے مسلمان ہونے کی شرط عائد نہ کرتے۔ اگر میں تمہارے قریب بھی پھٹکتا ہوں تو تم غصے میں بھر جاتے ہو۔ اس کے باوجود تم مجھے ایک ایسے مذہب کی دعوت دیتے ہو جس کے بنیادی اصول کا تم خود احترام نہیں کرتے۔"

میں بعض ایسے مسلمانوں کو بھی جانتا ہوں جو مذہبی رہنما بنتے ہیں لیکن اپنی زندگی میں انہوں نے ایک بار بھی اپنے خاکروب کے ساتھ بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور ان کو کبھی اپنے ساتھ کھانے

پر دعوت نہیں دی لیکن منبر پر آپ انہیں ہمیشہ ہندوؤں کی چھوت چھات کو بُرا بھلا کہتے اور اسلام کی مساوات کے گن گاتے سنیں گے۔ صریحاً منافقت دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت اس میں شک نہیں ہے کہ یہ گفتار میں تو مسلمان ہیں لیکن کردار ان کا چھوت چھات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندو کا سا ہے۔ اگر آپ نہایت بیباکی سے کسی مذہبی رہنما کو یہ کہہ دیں کہ عمل کے لحاظ سے ۹۹ فی صدی ہندو ہے تو وہ کسی سے آپ کو قتل کرا دے گا۔ لوگوں کو قرآن کے احکام بتانے کی بجائے ہمیں خود ان پر عامل ہونا چاہیئے۔ دنیا ہمارے عمل کو دیکھ کر ہمارے مذہب کی خوشی سے پیروی کرے گی مسلمان صرف بڑے لوگوں کو ہی مسلمان بنانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اور مصیبت کے ماروں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صرف ہندو ہی شودروں کو ہمیشہ کے لئے اچھوت خیال نہیں کرتے۔ بلکہ مسلمان بھی اس میں برابر کے شریک ہیں شودروں کی تمام اخلاقی اور جسمانی صلاحیتیں تباہ کر دی گئی ہیں ہندو و مسلم دونوں ہی بے رحم ہیں شودروں کا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کا ساتھی ہے اگر وہ انصاف اور محبت کرنے والا ہے تو شودروں کے ساتھ اتنا ظالمانہ سلوک کیوں روا رکھا گیا ہے۔ اور وہ گزشتہ چھ ہزار سال کے دوران میں ان کی مدد کو کیوں نہیں آیا شودروں کے سلوک کے سلسلہ میں مسلمان کو اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ہندوؤں کے برابر میں نے ضرور بے رحم پایا ہے شدھی یا تبلیغ کی تحریکیں اس لئے نہیں کہ ایک انسان کے ساتھ انسانیت کا سلوک کیا جائے بلکہ اس لئے ہیں کہ اپنی تعداد بڑھائی جائے۔ اور ہندو اور مسلمانوں کے اونچے طبقے سیاسی فائدے حاصل کریں ہندو کانگرسی اور مسلمان قوم پرست حکومت سے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے لئے شور و غوغا کرتے ہیں لیکن شودروں کے سلسلہ میں ان دونوں کے دلوں میں مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ہم نے چیل کی طرح بلند پروازی سیکھ لی ہے لیکن اپنی شکم پُری کے لئے ہم ہمیشہ

کسی مرد ار کی تلاش میں رہے ہیں ہم اپنے لئے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کی خاطر شودروں کو آلہ کار بنانا چاہتے ہیں ہم شودروں کو اپنا ملکی بھائی اور اپنے ایسا انسان نہیں سمجھتے۔ ہم ان کی قسمت پر مگرمچھ سے آنسو بہا رہے ہیں۔ لیکن ہم نے اچھوتوں کو چھونے کا فیصلہ بھی نہیں کیا۔ ہم اس سلسلہ میں اسلام پر عمل نہیں کرتے۔ اور رسول کریمؐ کی پیروی کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اچھوتوں کے لئے مسلمانوں کا کوئی پیغام نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے لئے اسلام میں کوئی کشش نہیں ہے۔ شودروں کے ساتھ ہندوؤں کے رویہ کی مسلمان مذمت کرتے ہیں لیکن وہ خود ایک لمحظہ کے لئے بھی شودروں کی بہتری کے لئے نہیں سوچتے۔ اور ان کے ساتھ خود بھی ایسا ہی رذیل سلوک کرتے ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ انسان انسان کو کتنا دکھ دیتا ہے۔ ہندوستان کے باہر کوئی بھی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ فطرت انسانی اتنی خبیث ہو سکتی ہے کہ شودروں کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک روا رکھے۔ ان بے شمار مظالم کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو انسانوں کو یہاں برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ہمارے ہم وطنوں کی اکثریت کے اجسام میں سعید ارواح نہیں ہیں۔ ہم کتنی بار اچھوت کی مدد کئے بغیر اس کے پاس سے گزر جاتے ہیں کیا ان کے اجسام میں روحیں نہیں ہیں۔ جب ہم روزانہ اچھوتوں کو دکھ پہنچاتے اور ان سے غلاموں کی نسبت دس گنا زیادہ ذلیل سلوک کرتے ہیں تو ہم ایک غیر ملکی حکومت کو کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ ہم اچھوتوں کے ساتھ دس گنا یا بیس گنا نہیں بلکہ ہزار گنا سے بھی زیادہ غلاموں سے برا سلوک کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو انسان کی خباثت پر اعتقاد نہیں رکھتے ہندوستان میں آئیں۔ اور اپنی آنکھوں سے حقائق کا مطالعہ کریں۔ اس سلسلہ میں محمد صلعم کے پیرو کار منو کے پیرو کاروں سے بھی ایک قدم آگے ہیں ہم مسلمانوں نے کچلے ہوئے لوگوں کے لئے ہمدردی کے تمام جذبات کھو ڈالے ہیں۔ ہم اگر زیادہ نہیں تو شودروں کو غلام رکھنے میں ہندو کے برابر کے شریک ہیں

اچھوتوں میں عزتِ نفس اور ان کے انسانی وقار کو کچلنے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ اور اس پر مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں ہندوستان کا مسلمان ریاکاری کی کتنی موثر اور زندہ تصویر ہے اسلام کے قوانین کے خلاف وہ اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اونچے طبقہ کے ہندوستانی مسلمان عوام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے قلبی صلاحیتوں کی بنیادوں پر نہیں بلکہ نسل و نسب کی بنیادوں پر اونچا طبقہ بنا لیا ہے۔ وہ اسلام کے دعوے دار ہیں لیکن ہندومت کی تقلید کرتے ہیں۔

شودر ایک قوم کی حیثیت سے صدیوں سے قعرِ مذلت میں گرے ہوئے ہیں۔ انہیں کون اپنے پاؤں پر کھڑا کرے گا؟ ان کا چہرہ کون صاف کرے گا؟ اور ان کی حالت کون بدلے گا کبھی نیک دل گاندھی جی سے مجھے بہت بڑی بڑی توقعات تھیں لیکن جب انہوں نے اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کے حقوق سے محروم کرنے میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں تو میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ ایک قوم کے لئے مخلوط انتخاب ضروری چیز ہے لیکن جن کے ساتھ کتوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہو۔ ان کے لئے جداگانہ انتخاب ایک ایسے مرہم کی حیثیت رکھتا ہے جو چھوت چھات کے بہت پرانے زخم کو مندمل کر سکتا ہے۔ جداگانہ انتخاب مظلوم کے حقوق کو تسلیم کرنے کی تدبیر ہے۔ ان کے سیاسی حقوق کو جداگانہ طور پر تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی طریقہ بھی ان کو اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں میں آلۂ کار بننے سے نہیں بچا سکتا انہوں نے ہماری محبت کا کافی تجربہ کر لیا ہے۔ اب اگر وہ انسانوں کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے اندر ہمارے یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے ہماری تقریروں اور وعظوں کو نہیں سننا چاہیئے۔ ہم میں اخلاص کا ذرہ بھی باقی نہیں ہے۔ کیا دنیا میں اور کوئی ایسی جگہ ہے جہاں انسانوں کے ساتھ اتنا ذلیل سلوک کیا جاتا ہو؟ چند

انسانوں کو چھوڑ کر ہندو مسلمان نہایت وفاداری سے اپنی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں ہندو مسلم رہنما صرف سیاسی مقاصد کی بنا پر ان کے ساتھ دوستی کرنے پر مجبور رہیں۔ ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ان کی یہ دوستی ایک طلسم فریب اور ایک ہمرنگ زمین دام ہے۔ شودروں کو یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ انہیں مکمل سماجی اور سیاسی حقوق کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اپنے آپ کو ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ تو مزید کئی ہزار سال کے لئے تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اچھوتوں کے لیڈروں کو چاہیئے کہ وہ اس مسئلہ کو حقیقی جذبہ کے ماتحت حل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ کبھی وہم و گمان میں بھی نہ لائیں۔ کہ ہندو مسلم لیڈروں کا ایک چھوٹا سا طبقہ مستقبل قریب میں اپنے خیالات کی ناقابل شکست دیوار کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہندو مسلم عوام کا ان کے ساتھ جو رویہ ہے وہ اس سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ جب اچھوتوں کے لیڈر مہاتما گاندھی جی کی دھمکیوں سے مرعوب ہو گئے تو میرے خیال کے مطابق دونوں نے ان کروڑوں انسانوں کے خلاف گناہ کیا۔ جو کبھی کے بے عزتی اور ذلت کو برداشت کر رہے ہیں۔ اچھوتوں کے لیڈروں اور ان کے ہمدردوں کا فرض بالکل واضح ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ ان کچلے ہوئے لوگوں کو احساس کرائیں کہ ان کے ہم وطن نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ان میں زندگی کی رُوح پھونکیں۔ بالفاظ دیگر جب تک ان کے دلوں میں ہندو اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جائیگا وہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہوں گے۔ جداگانہ انتخاب نے ان کو یہ موقع بہم پہنچایا تھا لیکن اب مخلوط انتخاب کی سکیم کے ماتحت کوئی اچھوت اس سلوک کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکے گا۔ جو ان کے ساتھ کیا جا رہا ہے اب پھر ان کو انہی لوگوں کے رحم کے سپرد کر دیا گیا ہے جنہوں نے ان کے ساتھ کبھی بھی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہندو مسلم میرے ان

خیالات کی مذمت کریں گے کیونکہ ان کا تعلق ان قوموں سے ہے جو اچھوتوں کو لوٹتی کھسوٹتی رہی ہیں۔ کیا مندروں میں داخلے کی تحریک اور صوبجاتی وزارتوں میں اچھوتوں کے وزیر بن جانے سے ہندوستان کی زندگی میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ اسے تو صرف ایک معمولی اصلاح کہا جا سکتا ہے لیکن اس کا مطلب لوگوں کے نقطۂ نگاہ میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اس قدر آہستہ خرامی کے ساتھ یہ سفر کئی ہزار سالوں میں پورا ہوگا۔ موجودہ سماجی نظام کے خلاف کوئی زبردست بغاوت ہی اچھوتوں کو بچا سکتی ہے مسلم لیگ اور کانگرس گاندھیوں اور جناحیوں کی اچھوتوں کے ساتھ بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوئی کوشش اچھوتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی ہماری عادت کو نہیں بدل سکے گی۔ کوئی تحریک جس کی بنیاد محبت پر ہو۔ انسانوں کے دلوں سے نفرت دور نہیں کر سکتی۔ غرور کا علاج صرف نفرت ہی ہے۔ ورنہ غرور بالکل لاعلاج مرض ہے۔ جو لوگ طبائع اور ذات پات کے امتیاز کے شکار ہیں۔ ان کو کسی سرگرم اقدام پر نہیں ابھارا جا سکتا۔ جو کمزور ہیں اور جنہیں آلۂ کار بنایا جا تا رہا ہے ضمیر بھی ان کی مدد پر آمادہ نہیں ہوتا۔ بھیڑ یا بھیڑوں کا نگہبان نہیں ہو سکتا۔ اور ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہندو مسلمان اچھوتوں کو آلۂ کار بناتے رہے ہیں۔ اس لئے اچھوتوں کی ترقی کا کام ان کے حوالے نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ خیال کرنا حماقت ہے کہ مسٹر جناح اور گاندھی جی پرانے انسان کو بدل دیں گے۔ اچھوتوں کی مشکلات کا حل ان کی بیداری میں ہے۔ جس کی بنیاد اس امر میں مضمر ہے کہ اچھوت ان لوگوں سے نفرت کریں۔ جو ان کے آلام و مصائب کا موجب رہے ہیں۔ محبت نفس کشی اور قربانی کا فلسفہ ان لوگوں کے لئے نقصان دہ ہے جن کی اب تک کسی نے پروا نہیں کی جن کو کوئی ایسا انسانی حق نہیں دیا گیا۔ اور جنہیں اعلےٰ خاندانوں اور اعلیٰ ذاتوں کے بتوں پر قربان کر دیا گیا ہے۔

میں نے جو کچھ شودروں کے لئے تجویز کیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے تجویز نہیں کر سکتا کیونکہ مؤخرالذکر میں جوابی سلوک کی اہلیت پیدا ہو چکی ہے۔ اور وہ جواب دینا جانتا ہے۔ وہ بعض اوقات دیوانہ وار تباہی اور بربادی کی غار میں بھی چھلانگ لگا جاتا ہے لیکن شودروں کی یہ حالت ہے کہ وہ چاروں شانے چت پڑے ہیں۔ اور اس قدر کمزور ہیں کہ احتجاج کے طور پر ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتے۔ لہذا دوسروں کو نفرت کرنے سے ان کو وہ طاقت ملے گی جس کی انہیں ضرورت ہے۔ جو لوگ اس وقت اچھوتوں کو بیدار کرنے کے کام میں منہمک ہیں۔ وہ سرمایہ داروں اور اونچی ذات والوں کے ایجنٹ ہیں۔ وہ اچھوتوں کو سلا دینا چاہتے ہیں۔

میرے ایک احراری دوست مولانا عبدالقیوم کانپوری نے جو میرے ساتھ راولپنڈی جیل میں قید ہیں۔ مجھے بتایا ہے کہ ہندو کارکن مسلمانوں کے خلاف اچھوتوں میں نفرت کی تلقین کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یو۔پی۔ بہار اور اوڑیسہ میں اچھوت اب مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے لگے ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال بالکل صحیح ہے۔ تو یہ پیغامِ اُمید ہے۔ مسلمان اس سلوک کے مستحق ہیں۔ پہلے تو مسلمانوں کو یہ سلوک برداشت کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہندو کے ساتھ بھی زود یا بدیر اچھوتوں کے ہاتھوں یہی سلوک ہو گا۔

اچھوتوں کو بیدار کرنے کے لئے ان میں نفرت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔ بعد ازیں فلسفہ محبت ان کی اس نفرت کو تبدیل کر دے گا۔ بہر حال ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح اچھوتوں کو ہوش میں لائیں۔ تا کہ وہ اپنے ساتھ کی گئی ذلّت و بے عزتی کو محسوس کریں۔ اگر ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ہماری اور اچھوتوں کی حالت سدھر جائے گی۔ اور اس ملک میں محبت کی حکومت ہو گی۔

اقتصادیات

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمان نہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلاتا ہے۔ اور نہ ضرورت
کے وقت کے لئے کچھ جمع کرتا ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام افراد کو دولت جمع کرنے کی اجازت
ہی نہیں دیتا۔ انفرادیت ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ اس کا مطلب صریحاً یہ ہے کہ تم غریبوں کا
خون چوس کر دھن، دولت اکٹھی کرتے رہو۔ اسلام اس انفرادیت کے سخت خلاف ہے۔ اور
یہی اس مذہب کا اقتصادی اصول ہے۔ سود خواری گناہِ کبیرہ قرار دی گئی ہے۔ اسلام غریبوں
اور طبقات سے خالی سماج کا مذہب ہے۔ اس لئے یہ لوگوں کی سیم و زر کے انبار اکٹھے کرنے
میں حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ شخصی ملکیت ریاست کی طرف سے فرد کے پاس ایک امانت
ہے۔ اور اسے اپنے منشا کے مطابق خرچ کرنے کا ریاست کو حق حاصل ہے۔ کوئی شخص اپنی

مرضی کے مطابق خرچ نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں واضح عدود متعین ہیں۔ اسباب تعیش پر ایک پائی بھی خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام کے سب سے بڑے جرنیل حضرت خالدؓ کو محض اس بنا پر موقوف کر دیا گیا تھا کہ انہوں نے ایک شاعر کو دس ہزار دینار بطور انعام دیئے تھے۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد تھا کہ یا تو خالدؓ نے یہ رقم بیت المال سے دی ہے اور یا اپنی جیب سے عطا کی ہے۔ اول الذکر حالت میں خیانت کا الزام عائد ہوتا ہے اور ثانی الذکر اصراف بیجا کے تحت آتی ہے۔ اس لئے ہر حالت میں ان کی برطرفی لازمی ہے۔ جب حضرت خالدؓ نے نظر ثانی کی درخواست کی تو حضرت عمرؓ نے ان کے بیس ہزار دینار اور ضبط کر لئے۔ حضرت عمرؓ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو صاف بچ جانے دیں جس نے اتنی بڑی رقم کا اصراف بیجا کیا ہو۔ کیونکہ اس طرح تو وہ شخص آئندہ بھی فضول خرچی کے ارتکاب کی جرأت کر سکے گا۔ رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ کرام اپنی شخصی ملکیت کی دولت کو ایک بہت بڑی برائی سمجھتے تھے۔ جن لوگوں کی دولت بڑھتی نظر آتی۔ اُن کی ملکیت کو ضبط کرنے میں حضرت عمرؓ نے کبھی تامل سے کام نہ لیا تھا۔ یہ ضبط شدہ رقم کسی ایک فرد کی جیب میں نہ جاتی تھی بلکہ غربا پر خرچ ہوتی تھی۔ رفاہ عامہ پر صرف کرنے کے لئے بہت کافی مشترکہ فنڈ موجود ہوتا تھا۔ اور سرمایہ داروں کے بغیر مسلم سماج خوش الحالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ طبقات سے پاک سماج کی ترقی صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب اس کے ہمسایہ میں سرمایہ پرست لوگ رہتے ہوں۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے ساتھ ہی عرب میں رہتے تھے لیکن انہیں مسلمانوں کو سود پر رقم دینے کی اجازت نہ تھی کیونکہ اس طرح اسلام کے خالی از طبقات سماج کا اقتصادی توازن درہم برہم ہو جاتا۔

ہندوستان میں اسلام کے اقتصادی نظام کو ایک سخت دھچکا لگا۔ مسلمانوں کے مقدر میں ایک ایسی عجیب و غریب قوم کے ساتھ بھی رہنا لکھا تھا جو نہ صرف دولت کی دیوی لکشمی

کی پوجا ہی کرسکتی تھی بلکہ انسانوں کو اپوتر اور اچھوت سمجھنے کی بھی عادی تھی۔ ہندوستان کا قانون مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ہاتھوں لٹنے سے نہ بچا سکا۔ اور خود اسلام بھی دوسروں کو لوٹنے کھسوٹنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کا اقتصادی زوال تھا۔ چھوت چھات کی وجہ سے ملک کی دولت ایک طبقہ میں سمٹتی جا رہی تھی۔ اور اس بنا پر مسلمانوں کی تکالیف میں اور اضافہ ہو گیا۔ ایک ہندو حتی الامکان کبھی بھی کسی مسلمان دوکان سے سودا نہ خریدے گا۔ مگر مسلمان ہندو دوکاندار کا مستقل گاہک ہے۔ ہندوستانی تجارت کے ہندو واحد اجارہ دار ہیں۔ چند ایک مسلمان تاجروں کا وجود ایک استثنا ہے جو کلیہ کو ثابت کرتا ہے۔

شاید یہ کہا جائے کہ تجارتی میدان میں مسلمانوں کے پیچھے رہنے کی وجہ چھوت چھات نہیں۔ بلکہ ان کی آرام پسندی اور فضول خرچی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلمانوں کی فضول خرچی اور ہندوؤں کا سلوک دونوں ہی مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کے لئے مہلک ہیں۔ اگرچہ انگریز کو دکاندار کہا جاتا ہے لیکن وہ مخالف سے فراخ حوصلگی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس لئے وہ ہندو دکاندار کا لگا نہیں کھا سکتا۔ مسلمانوں جیسی فضول خرچ قوم ہندوؤں جیسی محتاط قوم کے ساتھ بغیر اپنی تباہی کئے کس طرح رہ سکتی ہے۔ ہندوؤں کی طرح انگریز بھی انگریز کی دکان کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور بعد میں ہندو یا مسلمان کی دکان پر آتے ہیں۔ لیکن مسلمان کے دل میں اس قسم کے تعصبات موجود نہیں ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ملکی تجارت کا میدان ہندو کے ہاتھ رہا۔ اب چند سالوں سے سیاسی و مذہبی بیداری کی بنا پر مسلمانوں کا ایک حصہ یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ جب تک وہ بھی ہندو کی طرح متعصب نہ ہوں گے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ہندو نے مسلمان کا مقاطعہ شروع کر رکھا ہے اسی طرح مسلمانوں کا یہ حصہ ہندو کا بائیکاٹ کرنے پر زور دے رہا ہے۔ ان مسلمانوں میں سے چند

ایک بہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہندو سوسائٹی کے رویّہ میں بہتر تبدیلی ہو رہی ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس تبدیلی کی رفتار اتنی سست ہے کہ صدیوں تک یہ موثر شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ اور اس دوران میں مسلمان روز بروز کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔ انہیں کانگرس کے اصلاحی اقدامات میں کوئی یقین نہیں مسلم عوام اشتراکیت پر بھروسہ کرنے کو تیار ہیں لیکن ہندو قوم اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتی مسلمانوں کو اب بھی یہی امید ہے کہ نئے نظام میں ہندو انہیں اپنے برابر سمجھے گا مگر جب تک پرانا نظام باقی ہے۔ ان کی قسمت بدل نہیں سکتی۔ کسی مسلمان دکان پر آپ کو شاذ و نادر ہی کوئی ہندو گاہک نظر آئے گا لیکن ہندو دکانیں آج بھی مسلمان گاہکوں سے بھری رہتی ہیں "مسلمان سے خریدو" کی تحریک ابھی تک کمزور ہے کیونکہ تا حال یہ غیر منظم ہے۔ مگر ہندو کے خلاف جذبات موجود ہیں لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان ہندو سے نفرت کرتے ہیں اور ہندو اپنے منافرت انگیز رویّہ کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ مگر مسلمان پھر بھی ہندو دکان پر جاتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جب تک مقاطعہ کی تحریک نہایت دانشمندی کے ساتھ منظم نہ کی گئی ہو۔ اور اسے مذہب کا ایک جزو نہ بنا لیا گیا ہو۔ اس وقت تک اس کی ناکامی لازمی ہے۔ کانگرس کی بائیکاٹ کی تحریک میں ہمیں اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ ہر ہندوستانی اس امر سے آگاہ تھا کہ بدیشی اشیاء ملکی اقتصادیر کتنا برا اثر ڈالتی ہیں۔ چنانچہ جب کانگرس کی مقاطعہ کی تحریک زوروں پر تھی۔ تو ہر ہندوستانی نے سودیشی چیزیں خریدنے کا برضا و رغبت حلف اٹھایا۔ مگر چند ماہ بعد یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور احساس کے باوجود لوگوں نے بدیشی اشیاء پھر خریدنی شروع کر دیں۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ ہندو کے رویّہ کی پُر زور مذمت کی جاتی ہے۔ مگر مسلمان گاہک آج بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندو دکان کی طرف رجوع کرتے ہیں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہندو کسی بغض کی بنا پر مسلمان سے سودا لینے سے انکاری نہیں

بلکہ یہ اس کی روزمرہ کی عادت ہوگئی ہے کہ مسلمان دکان پر نہ جائے۔ چونکہ میں مٹھائی، دودھ اور روٹی وغیرہ اس ہندو سے نہیں خریدتا جو مجھ سے اچھوت کا سا سلوک کرتا ہو۔ اس لئے میری یہ عادت ہوگئی ہے کہ ہندو دکان سے کوئی بھی سودا نہیں خریدتا۔ اگرچہ مجھے ہندو سے نفرت نہیں لیکن میرے قدم ہندو دکان کی طرف شاذو نادر ہی اُٹھتے ہیں۔ اگرچہ ہندو صرف آگ پر پکی ہوئی چیز کے سلسلہ میں مسلمان کو اچھوت سمجھتا ہے لیکن ہر چیز صرف ہندو دکان سے خریدنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ اگر وہ کسی مسلمان دکان پر جاتے ہیں تو بڑی ہمت اور مشکل کے بعد ——— یہی چیز مسلمان قوم کی اقتصادی بربادی کا باعث ہے۔ میں اس بات پر متفق ہوں کہ مسلمان مشکل سے کماتا ہے۔ بے احتیاطی سے خرچ کرتا ہے۔ اور حساب کتاب رکھنے سے اسے قدرتی نفرت ہے لیکن صرف حساب کی ناقابلیت اور سودخواری کی ممانعت ہی نے انہیں ساہوکاروں کے رحم پر نہیں چھوڑ رکھا۔ ان کے ماتھے پر اچھوت کا جو ٹیکا ہے وہ ان کی تجارت کو تباہ کر دیتا ہے کیونکہ ہندو کبھی اس سے سودا خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی واہمہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ستر فی صدی مسلمان ہندو سے سودا لیتے ہیں۔ اور صرف پانچ فی صدی ہندو مسلمان دکان کے خریدار ہیں۔ کئی پشتوں سے مسلمان زوال و ادبار میں مبتلا ہیں۔ ہندو کسی مسلمان کو ہندو بازار میں دکان نہیں لینے دیتے۔ شروع شروع میں ہندو اور مسلمان الگ الگ محلوں میں رہتے تھے۔ ہندوؤں نے اپنی حفاظت کے لئے اپنے محلوں میں بڑے بڑے آہنی دروازے لگا رکھے ہیں۔ جن کی وجہ سے کوئی مسلمان پھیری والا ہندو محلہ میں نہیں جا سکتا۔ اگر میں کسی اچھوت سے یہ سوال کروں کہ تم تجارت کیوں نہیں کرتے تو اس کا صریح مطلب اس کے زخموں پر نمک پاشی ہے۔ کوئی ہندو یا مسلمان ان سے سودا خریدنے پر آمادہ نہیں۔ اور ان کی اپنی قوم میں فرقہ پرستی کا مادہ جذبہ پیدا نہیں ہوا جس کی بنا پر ان میں اچھوت

سے خرید و" کی تحریک شروع ہو سکے۔ اس لئے اس امر کی کوئی امید نہیں کہ اچھوت صرف اچھوتوں سے خریدیں گے۔ چنانچہ کسی اچھوت کی تجارت کی کامیابی کی ذرہ برابر بھی توقع نہیں ہو سکتی شودروں کے بعد مسلمانوں کی باری آتی ہے ہندو مسلمان کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس کی تجارتی کامیابی کی بہت کم امید ہے۔ اسی لئے دور بین مسلمانوں میں یہ احساس عام ہے کہ جب تک مسلمان ہندو کی طرح متعصب نہیں بنے گا۔ اس کا مستقبل ہندوستان میں نہایت تاریک ہے مسلمان کا مذہب اس سلسلے میں چنداں مفید ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اسلام میں کوئی شخص نجس اور اچھوت نہیں ہے۔ صرف مساجد ہی مقاطعہ کی تعلیم دینے کے لئے موزوں ہو سکتی ہیں لیکن مذہب کی بنا پر ملّا اس سلسلہ میں بالکل بے بس ہے۔ مسلم علما نے اس مسئلہ پر بحیثیت مجموعی کبھی غور نہیں کیا۔ اس لئے "مسلمان سے خرید و" کی تحریک مذہبی نہیں۔ بلکہ عوام کی تحریک ہے۔ کیونکہ عوام ہی ہندو سلوک کی اذیّت کو محسوس کرتے ہیں لیکن کوئی رہنما ایسا موجود نہیں۔ جو ان کے سامنے تعمیری پروگرام پیش کر کے انہیں روزمرّہ کی ذلت سے نجات دلا سکے۔ جب کسی مظلوم قوم کو اپنے احساسات کے اظہار کے لئے کوئی پُرامن ذریعہ میسر نہ ہو سکے۔ تو وہ عموماً تشدد پر اتر آتی ہے مسجد کے سامنے باجہ اور بقر عید پر ذبح ہونے والی گائیوں کا جلوس نکالنا دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہیں۔ فرقہ دارانہ مناقشات اور ان کے اسباب کی تاریخ پر غائرانہ نظر ڈالنے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ برطانی راج سے قبل مسلم عوام بے حس تھے۔ اور اعلیٰ طبقات برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے مغرور تھے۔ اور خود کو ہندوؤں سے برتر سمجھتے تھے۔ اس لئے قوم میں کوئی فرقہ دارانہ جذبات موجود نہ تھے۔ لہٰذا کوئی جھگڑا بھی نہ ہوتا تھا۔ ہندو عوام انگریز کو بھی مسلمان ایسا اچھوت سمجھتے ہیں لیکن کوئی انگریز ہندو سے نفرت نہیں کرتا۔ کیونکہ جو اونچی جاتی کے ہندو ان کے پاس جاتے ہیں وہ ان سے رذیل سلوک کرنے کی جرأت کبھی نہیں کرتے

وہ ان کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ اور انہیں دعوتیں دیتے ہیں لیکن جونہی موجودہ دور ختم ہوا اور انگریز کو یہاں حاکم کی بجائے ہندوستانی کی حیثیت میں رہنا پڑا۔ تو وہ بھی چھوت چھات کے اذیت دہ اثرات محسوس کریں گے۔ مغلوں کے زمانہ میں مسلمانوں کو بھی ان اثرات کا احساس تک نہ تھا۔ آج بھی انہیں ان کا مکمل احساس نہیں کیونکہ ہندوؤں کا سرمایہ دار طبقہ ہندو سماج کے اصولوں پر مکمل طور پر عمل پیرا نہیں مگر اب مسلم امراء نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ چھوت چھات کی بنا پر مسلم عوام کی حالت کتنی تباہ کن ہو چکی ہے۔ برطانوی حکام نے موجودہ فرقہ کے مسئلہ کے جائزہ کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ انہوں نے مسلم عوام کی بڑھتی ہوئی غربت کو آشکارا کیا۔ اور اپنے انوکھے انداز میں ان کی مدد کرنی چاہی۔ ہندو کے خوف کی وجہ سے انہوں نے چھوت چھات کے سوال کو نمایاں حیثیت نہ دی۔ حکومت برطانیہ نے شودروں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا۔

چھوت چھات غلامی کی بدترین قسم ہے۔ یہ سب کچھ مہاتما منو کی مہربانی ہے۔ انہوں نے اس دنیا کے باسیوں کو مختلف اقوام میں رہنے کی بجائے دشمنی کی زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیا۔ اور اب یہ دشمن قومیں لامتناہی جنگ میں مصروف ہیں۔ آج جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا تو مجھے روزنامہ ”ٹریبیون“ کا ۲۶ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کا پرچہ پہنچا۔ اس میں گاندھی جی کا ایک بالکل نیا مضمون ”ہریجن“ سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون میں نیچے درج کرتا ہوں۔ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ صورت حال کو بیان کرنے میں میں نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔

”بمبئی ۲۵ مئی۔ ایک مراسلہ نگار نے گاندھی جی سے یہ سوال کیا کہ کیا وہ اس بات میں متفق ہیں کہ جو لوگ ہریجنوں کو اپوتر اور اچھوت خیال کرتے ہوں۔ اور ان کو چھونے سے بھرشٹ ہو جاتے ہوں۔ اور ان کے ساتھ ملتے جلتے نہ ہوں۔ انہیں ستیہ گرہ میں شامل ہونے کی قطعاً اجازت نہ دی جاتے۔ اس استفسار کے جواب میں گاندھی جی نے آج کے ہریجن میں یہ

لکھا ہے۔ کہ مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں۔ کہ جس شخص کے دل میں تھوڑی سی بھی چھوت چھات موجود ہے۔ وہ سنیہ گرہی ہونے کا قطعاً اہل نہیں۔ اور میں چھوت چھات کو اپنے زوال و ادبار اور ہندو مسلم مخاصمت کی جڑ سمجھتا ہوں۔ یہ ہندو مت کی لعنت ہونے کی وجہ سے تمام ہندوستان کے لئے ایک لعنت ہے۔ اس کا داغ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ مذہب کی تبدیلی کے باوجود بھی دور نہیں ہوتا۔

ایک اور مراسلہ نگار نے یہ سوال کیا ہے کہ کیا چھوت چھات کو دور کرنے کا یہ زود اثر حل نہیں۔ کہ کانگرس ہریجنوں کو باورچی کا کام سکھانے کی تحریک شروع کرے۔ اور اس طرح جو ہریجن باورچی تیار ہوں۔ وہ کانگرس کے آشرموں اور مطبخوں میں باورچی کا کام کریں۔ اس سوال کے جواب میں گاندھی جی لکھتے ہیں کہ ہماری خواہش ہریجنوں کو بلند ترین مقام پر پہنچانے کی ہونی چاہیئے لیکن جب تک یہ آدرش حاصل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک یہ ایک عمدہ تجویز رہے گی کہ بعض ہریجنوں کو باورچی کا کام سکھا دیا جائے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جوں جوں ہم ہریجنوں کے سپرد گھریلو خدمات کرتے جاتے ہیں۔ توں توں اصلاح کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔ یہ ہریجن ہمارے گھرانوں میں مدغم ہو کر احساس کمتری کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ اور باقی ہریجنوں اور اونچی جاتی کے ہندوؤں کے درمیان ایک زندہ رشتہ اتحاد بن جاتے ہیں۔" (یونائیٹڈ پریس)

یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہندوستان کا یہ مقتدر رہنما آخر کار صحیح نتیجہ پر پہنچا ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسا اقدام نہیں کیا گیا جو یہ ظاہر کر سکے کہ کانگرسی لیڈر اس معاملہ پر مخلصانہ و دیانتدارانہ طریق سے سوچ بچار کریں گے۔ گاندھی جی اپنا تمام وقت اور اپنی تمام صلاحیتیں شودروں کے ماتھے سے اچھوت کا ٹیکہ دور کرنے میں صرف کر رہے ہیں لیکن ہندو جو سلوک

مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس کا یونہی سرراہے سرسری ذکر کر دیتے ہیں۔ اس سے ایک عامی یہ اندازہ کرتا ہے کہ گاندھی جی مسلمانوں کے ماتھے سے اچھوت کا داغ دُور کرنے کے لئے کوشاں نہیں ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی حالت پر بھی شودروں جتنی توجہ کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کو یہ جان لینا چاہیئے کہ شودروں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اونچی جاتی کے ہندو ان سے بغلگیر ہو رہے ہیں مسلمانوں کو قوم پرست ہندوستان کے اس ہندو لیڈر کے رویہ کی مذمت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ارد گرد ہمیشہ ایسے بزرگ رہتے ہیں۔ جو مسلمانوں کی نسبت شودروں کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اور مسلمانوں نے اس ہندو رہنما کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی بعض مسلمان گاندھی جی کو چالاک بنیا کہتے ہیں۔ جو مسلمانوں سے صرف لفظی ہمدردی کرتا ہے۔ اور اس کے قلب کی گہرائیوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ مسلمان ہندو کے غلام بن کر رہیں۔ میرے نزدیک گاندھی جی کے متعلق اس قسم کا خیال کرنا صریحاً ناانصافی ہے۔ ہم نے اپنا معاشری مسئلہ ان کے سامنے پیش کر کے کبھی بھی ان سے مشورہ نہیں چاہا۔ اور نہ شانتی کے ساتھ کبھی ان کی باتوں کو سُنا ہے۔ آخر وہ بھی ایک انسان ہیں، اور اپنے ماحول سے متاثر ہو سکتے ہیں جب تک علی برادران، گاندھی جی کے ساتھ رہے اُس وقت تک گاندھی جی بہ نسبت ہندوؤں کے مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ سوچا کرتے تھے۔ مگر قسمت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ مہاتما جی پہلے تو علی برادران کی جیب میں رہا کرتے تھے لیکن قسمت نے انہیں ایسے لوگوں کی آغوش میں ڈال دیا جو فطرتاً ہندو کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں مولانا ابو الکلام آزاد ایک عالم ہیں، علماء ہمیشہ ہی شرمیلے ہوا کرتے ہیں، اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کی سیرت پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ وہ کسی کے ساتھ کھل کر

بات کرنا اور اس سے اپنا نظریہ منوانا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو گاندھی جی کے دربار میں کوئی رسائی حاصل نہیں۔ علاوہ ازیں جب زیر بحث مسئلہ اتنا زیادہ پیچیدہ ہو۔ تو صرف ایک انسان کی خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مساعی بارآور نہیں ہوسکتیں۔ ہندو قوم ہمیشہ دوسروں کو ہندوستان سے نکالنے کی مشتاق رہی ہے۔ ایسی تنہائی پسند قوم میں کسی قسم کی اصلاح کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہاں پنجاب میں ایک قومی ادارہ "سرونٹس آف پیپل سوسائٹی" کے نام سے موجود ہے۔ اس پر صوبہ کے صف اوّل کے ہندو دیش بھگتوں کا قبضہ ہے۔ وہ کسی مسلمان کو اس سوسائٹی میں شامل نہیں کرتے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندو ایسے تنہائی پسند ماحول میں پلتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان بیٹھنے میں ایک قسم کی بے اطمینانی اور گھبراہٹ سی محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ چندہ دینے والے ہندو ہیں۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو اس ادارہ میں اگر شامل کریں۔ تو وہ ہندو دانیوں کی ہمدردی گنوا بیٹھیں گے۔ پنجاب میں ایک ایسی بیمہ کمپنی بھی ہے جس کا انتظام سربرآوردہ ہندو دیش بھگتوں کے ہاتھ میں ہے لیکن وہ شاذ و نادر ہی کسی مسلمان کو ملازم رکھتے ہیں۔ اس لئے صرف زبانی جمع خرچ ہی عملی مشکلات کا حل نہیں۔ اگر کوئی شخص گاندھی جی پر یہ زور دے۔ کہ وہ ہندوؤں کو اقتصادی میدان میں تنہائی پسندی کو ترک کرنے کے لئے سمجھائیں۔ تو کیا کوئی بھی ہندو گاندھی جی کی بات سنے گا؟ اس کا جواب صریحاً نفی میں ہے۔ کیونکہ اس کی ہندوؤں سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی۔

المختصر ہندو نے مسلمان کا صرف مجلسی بائیکاٹ ہی نہیں کر رکھا۔ بلکہ انہیں کاروبار میں بھی نزدیک نہیں آنے دیتا۔ مگر ایک مسلمان گاؤں میں ہندو بنیا آج بھی اقتدار و وقار کا مالک ہے۔ اور ہندو جاٹوں کے دیہاتوں میں ہندو بنیئے سے نفرت کی جاتی ہے۔ اور

سکھوں کے گاؤں میں تو اسے ہمیشہ پریشان کیا جاتا ہے لیکن ہندو بنیا بھی مسلمان کے ساتھ فیاضانہ سلوک نہیں کرتا۔ اقتصادی میدان میں ہندو کی اس تنہائی پسندی نے مسلمان کی حالت کو بہت قابلِ رحم بنا دیا ہے۔ اور مسلمان عوام میں تعمیری پروگرام پر عمل کرنے کی اب کوئی ہمت باقی نہیں رہی۔ غربت کی بنا پر مسلم عوام آج زود حس ہو چکے ہیں۔ اور ہندو سے دست و گریباں ہونے پر انہیں بآسانی بھڑکایا جا سکتا ہے۔ یہ جنون انہیں بہت مہنگا پڑا ہے۔ وہ ہندوؤں کو قتل تو کر دیتے ہیں لیکن خود وہ زیادہ تعداد میں پھانسی لگتے ہیں اور اس طرح ان کے متعلقین کی ایک بہت بڑی تعداد مصیبت میں پھنس جاتی ہے میں قارئین کی توجہ سکرٹری سندھ مسلم لیگ کی اس اپیل کی طرف مبذول کراتا ہوں جس میں آپ نے منزل گاہ سکھر کے فسادات کے اسیروں کی مالی امداد کے لئے مطالبہ کیا ہے۔ سید علی محمد راشدی سکرٹری سندھ مسلم لیگ لکھتے ہیں :۔

"مختلف علاقوں میں تقریباً اٹھارہ سو مسلمانوں پر مقدمات چل رہے ہیں۔ جو جیل کی چار دیواری میں بند ہیں۔ ان کے کنبے بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور ان کی عورتوں اور بچوں کو پہننے کے لئے کپڑا تک میسر نہیں۔ اب تک کئی مسلمانوں کو پھانسی کی سزا مل چکی ہے۔ اور بعض کو لمبی سزائیں دی گئی ہیں۔ ان فاقوں مرتی ہوئی عورتوں اور بچوں کے نام پر میں تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں۔ کہ ان کی امداد کے لئے جہاں تک ہو سکے ہاتھ بٹائیں۔"

کچھ عرصہ ہوا کہ مجھے پنجاب کی جیلوں کا وزیر مقرر کیا گیا تھا اس زمانہ میں مجھے فسادات کے چند ایسے سزا یافتہ مسلمان قیدیوں کا علم ہوا جنہیں طویل سزائیں ملی تھیں۔ اور جن کے بیوی بچے بھوکوں مر رہے تھے۔ اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا مسلم عوام غربت زدہ اور غیر منظم ہیں۔ اور مسلمان امراء لاپرواہ اور بے حس لیکن حالات کی نامساعدت کے

باوجود مسلم عوام مشتعل اور فساد پر آمادہ رہیں گے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ان کے اپنے وطن میں
اجنبیوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ ملک کی اوّلین ضرورت یہ ہے کہ ہندو ایک ایسی مضبوط
جماعت قائم کریں جو یہ تحریک شروع کرے کہ مسلمانوں کو اچھوت نہ سمجھا جائے۔ اگر کوئی
مسلم انجمن یہ کام شروع کرے گی۔ تو اس سے تعلقات بجائے رو بہ اصلاح ہونے کے اور
تلخ ہو جائیں گے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب خلافت کمیٹی کے موجودہ احرار کارکنوں نے ہندو
رویّہ کی مذمت شروع کی ہندوؤں نے اس کو بُرا مانا حکومت نے اس تحریک میں حصہ
لینے والوں کو گرفتاری کی دھمکی دی۔ بہرحال یہ اچھوت کا داغ مسلمان پر سے دور کرنا
ہے۔ اگر ہندو اپنے ہم مذہبوں کے ذلیل رویّہ کی مذمت شروع کر دیں۔ تو ہندو مسلم اتحاد
کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان انجمن نے یہ کام شروع کیا تو ہندو اس
کی مخالفت کریں گے۔ جب سیوا سمتی کی بنیاد رکھی گئی۔ تو مسلمان بہت خوش تھے۔ کہ یہ جماعت
ہندو کے سلوک کی مذمت کے سلسلہ میں مسلمان کے لئے ممد ثابت ہو گی۔ لیکن بسا آرزو
کہ خاک شدہ۔ اس جماعت نے مسلمانوں کو بے عزت کرنے کے لئے نئے نئے ہتھیار
استعمال کرنے شروع کر دیئے سیوا سمتی کے رضا کار ہندوؤں کو تو گلاسوں میں اور مسلمانوں
اور بھنگیوں کو کھوکھلے بانس کی نل کے ذریعے پانی پلاتے ہیں۔ اس نل کے ایک سرے
میں پانی انڈیل دیا جاتا ہے۔ اور دوسرے سرے سے یہ پانی نکل کر مسلمان اور بھنگی کے
چلّو میں آپڑتا ہے۔ اس طرح سے یہ خطرہ دور ہو جاتا ہے کہ مسلمان یا شودر ہندو رضا کار
کو چھو کر بھرشٹ کر دیں گے۔ وہ پانی تو پلاتے ہیں۔ لیکن خودداری چھین لیتے ہیں۔ اس
خدمتِ خلق سے منافرت اور زیادہ ہو گئی ہے۔ اگرچہ ایک مسلمان کے چھونے سے بانس
اپوتر نہیں ہوتا۔ تاہم اگر پانی پینے کے دوران میں مسلمان کا ہاتھ اسے چھو جائے تو اسے

برا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہمارے دیہاتوں میں اس قسم کے بانس کے نل عموماً گائیوں، بھینسوں کے حلقوں میں دوا انڈیلنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ آج سے چالیس سال قبل کسی ریلوے اسٹیشن پر کوئی مسلمان پانی پلانے کے لئے ملازم نہ تھا۔ ہندو پانی پلانے والے اعلیٰ گھرانوں کے مسلمانوں کی بھی بے عزتی کر دیتے تھے۔ چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ مسلمانوں نے ریلوے حکام پر زور ڈالا کہ مسلمانوں کے لئے پانی کا علیحدہ انتظام ہو۔ اور اب گاڑیوں کی آمد و رفت کے وقت تقریباً ہر اسٹیشن پر "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ چیز ہندوستانیوں کے ایک قوم ہونے کی زندہ تردید ہے۔ اگر کوئی صحیح معنوں میں ہندو قوم پرست موجود ہے تو اسے چاہیئے کہ مسلمانوں کے خاموش احتجاجات کی حوصلہ افزائی کرے۔ جن کے ذہن مردہ نہیں ہو چکے، اور جو ہندو کے سلوک کو پسند نہیں کرتے۔ اگر ہندو مسلمان کی ہمت بندھائیں تو اس ملک میں امن و محبت کا دور دورہ ہو گا۔ اگر اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لئے مسلمان کا کسی نے ہاتھ نہ بٹایا تو ہندوستان میں بدنظمی و ابتری پھیل جائے گی۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ موجودہ صورتِ حالات کو جلد بدلنا چاہیئے۔ اس لئے کسی ہندو جماعت کو یہ مقصد لے کر میدانِ عمل میں نکلنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے ساتھ بہتر مجلسی سلوک کیا جائے۔ ہندوؤں کے ہتک آمیز رویہ کی بنا پر مسلمانوں میں تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ یہ تبدیلی ہماری خواہشات کی ناکامی کا باعث ہو گی۔ ہندوؤں کے مجلسی اور اقتصادی بائیکاٹ نے مسلمانوں کی حالت بہت ابتر کر رکھی ہے۔ اور اس کے ردِ عمل کے طور پر ان میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ وہ بھی ہندو کا بائیکاٹ کر دیں۔ اگرچہ مالدار قوم کا مقاطعہ کرنا کچھ سہل اور خالی از مصائب و مشکلات نہیں لیکن مسلمان اب بلیاک ہو چکا ہے۔ گرمیوں میں انہیں جھلستی ہوئی دھوپ اور سردیوں میں کٹکٹاتے ہوئے پالے

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور ہندو برادرانِ وطن کا مجلسی سلوک، اور بھی زیادہ اذیت کا باعث ہو رہا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا آتش بیان خطیب بھی مسلمانوں کو وطنی خدمات کے لیئے ابھار نہیں سکتا۔ مسلمان یہ دیکھتا ہے کہ اگرچہ وہ اسی مادرِ ہند کا فرزند ہے۔ لیکن جو لوگ اس مشترکہ مفاد کے لیئے خونی قربانی کی توقع رکھتے ہیں۔ وہی اسے اچھوت سمجھتے ہیں۔ اس لیئے مسلمان تمام کرہ ارض کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جب تک مجلسی اور اقتصادی پیچیدگی سلجھائی نہیں جاتی۔ وہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کا خیال تک بھی کرنے کو تیار نہیں ؎

زبان

ایک مشترکہ زبان ایک قوم کا جزوِ اول ہے۔ اس اعتبار سے ہم بہت بدقسمت ہیں اس ملک میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اردو ہندی کے مسئلہ پر ہندو مسلمان باہم برسرِ پیکار ہیں۔ شمالی ہندوستان میں ہندوستانی بولی جاتی ہے۔ اسے اس خطہ کا ہر شخص سمجھتا ہے لیکن اس قطعہ ملک کی کتابی زبان مفرّس اردو اور سنسکرت آمیز ہندی ہے۔ اس سوال نے ایک شدید نزاع کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور ہر دو اقوام کے مابین خلیج کو اور وسیع کر دیا ہے۔ ایک زبان کی خوبی و خوبصورتی اس امر میں ہے کہ جو زبان بولی جائے وہی لکھی جائے۔ لیکن ہندوستانی کو فارسی نما یا سنسکرت آمیز بنانے کے جنون نے اس مسئلہ کو ایک ٹیڑھی کھیر بنا دیا ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اردو، ہندو و مسلمانوں کی متحدہ د

مخلصانہ احساس و مساعی کا نتیجہ تھی۔ کہ تمام ملک کے لئے ایک مشترکہ زبان ہونی چاہیئے
اردو نے سنسکرت، فارسی، پنجابی، عربی اور انگریزی کے تمام موزوں الفاظ اپنا لئے۔
جوں جوں فرقہ وارانہ مناقشہ بڑھتا گیا، ہندوؤں میں لازمی طور پر یہ جذبہ ترقی کرتا گیا۔ کہ
ہندی ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیئے۔ دورِ مغلیہ میں عدالتی زبان فارسی تھی۔ برطانی عہد میں
فارسی کی جگہ انگریزی اور اردو نے لے لی۔ مسلمان آج بھی اردو کو ملک کی مشترکہ زبان
سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندی کو اردو کے مقابلہ پر لانا ہندو مسلم اتحاد کے راستہ
میں روڑے اٹکانا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندی کو ہمہ گیر بنانا ان کا فطری حق ہے۔ چنانچہ
دونوں قومیں اس سوال پر دست و گریباں ہو رہی ہیں۔ تقسیمِ بنگال سے کچھ عرصہ قبل حکومت
بہار نے اردو ہندی کا سوال پیدا کیا تھا۔ حکومتِ بہار کے اس اقدام سے مسلمان ناراض
ہو گئے۔ تقسیمِ بنگال کے بعد پنجاب میں پنجابی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تحریک شروع ہو گئی۔ ہندوؤں
نے اردو کی مخالفت کی۔ ان کے طرزِ عمل سے مسلمانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ ہندو اپنی پرانی
مخاصمت کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ اردو ہی ملک
کی واحد مشترکہ زبان ہے۔ انہوں نے اس بات پر جتنا زور دیا، ہندوؤں نے اتنی ہی مخالفت
کی۔ چنانچہ چند ہی سالوں میں ہندوؤں نے اردو کو دھتا بتایا۔ اور نہایت سرگرمی و تندہی
کے ساتھ ہندی کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اگرچہ ابھی تک اردو سب
سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ مگر کتابی زبان کی حیثیت سے ہندی اردو سے آگے نکل گئی
ہے۔ اور اس کی وجہ ہندو سرمایہ دار اور ہندو لیڈر ہیں۔ کانگرسی وزارتوں اور فلموں نے
ہندی کی اشاعت میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ مسلمان ہمیشہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے توکل علی اللہ
کئے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی حیثیت اس مسافر کی سی ہے جو گاڑی کا ٹکٹ تو نہ خرید سکے۔ اور ریل

چل پڑے۔ نوجوان مسلمان مصنف ذہنی و قلبی صلاحیتوں کے اعتبار سے کسی سے پیچھے نہیں لیکن وہ صرف تصنیف کے سہارے زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اور اس سعیِ غیر مشکور سے جلد ہی کنارہ کش ہو جاتے ہیں مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کا نام اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا لیکن باوجود از حد ہر دلعزیزی کے انہیں بسر اوقات مشکل تھی۔ اور جب انہوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا۔ تو چند ہی سال بعد وہ آسودہ حال ہو گئے اردو کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز کتاب سینکڑوں کی تعداد میں بکتی ہے لیکن ہندی کی کتاب ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہے کیونکہ ہندو امیر ہونے کی وجہ سے کتابیں خرید سکتا ہے۔ اور مسلمان اپنی غربت کی وجہ سے مانگ کر یا لائبریری کی کتابیں پڑھتا ہے۔ ایک افلاس زدہ قوم خواہ وہ کتنی ہی قابل کیوں نہ ہو۔ اچھا لٹریچر پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ تصنیف سالہا سال کے صبر آزما مطالعہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ مطالعہ کسی حوصلہ افزائی یا سرپرستی کے بغیر زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اردو کے مصنّفوں کی تعداد بے شمار ہے۔ جس مسئلہ پر وہ خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیتے لیکن افلاس ان کے جسموں کو کھا جاتا ہے۔ اور اردو کے مصنّف ہونے کے جرم میں ان کی ہڈیاں نکل آتی ہیں۔

ہندوؤں پر اردو کو ٹھونسنا ایک احمقانہ حرکت ہے۔ وہ اس کی طرف راغب ہی نہیں ہیں جو زبان انہیں پیاری ہے اسے قائم رکھنے کا انہیں ہر طرح سے حق حاصل ہے۔ غریب قوم کا ادب بھی غریب ہوتا ہے۔ امراء کو اپنا بلند پایہ ادب ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بعض مسلمان اس چیز کے تو قائل ہیں۔ کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ ہندو اردو کو اپنا لیں مسلمان کانگرس کی اس کوشش کا خیر مقدم کرتے کہ ہندوستانی ہی ملک کی مشترکہ زبان ہو۔ لیکن اس ہندوستانی کا مطلب لازمی طور پر سنسکرت آمیز ہندوستانی

ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان بلند پایہ ادب کے دلدادہ ہیں لیکن سیاسی واقتصادی
وجوہات کی بنا پر وہ اردو کو تمام ملک میں ہر دلعزیز نہیں بنا سکتے۔ میں یہ جانتا ہوں۔ کہ ہندو
سیاستین زبان کے مسئلہ کو مکمل طور پر حل کرنا چاہتے ہیں لیکن اس مسئلہ نے پیچیدہ صورت اختیار
کرلی ہے۔ اور اسے دس ۱۲ بارہ سال میں سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اردو پر بہت زیادہ زور دینا ایک
سماجی مرض کا نتیجہ ہے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اس لئے
جب تک ان کے معاشرتی تعلقات نہیں سلجھتے۔ اس وقت تک ایک مشترکہ زبان کے قیام کی
امید تشنہ تکمیل ہی رہے گی۔ فارسی اور عربی کے کھنڈرات پر ہندوستانیوں کی قومی اور متحدہ مساعی
سے اردو کی عمارت کھڑی کی گئی۔ لیکن جلد ہی یہ اچھوتوں کی زبان ٹھہرائی گئی۔ اور ہندوؤں کے
استعمال کے ناقابل قرار دی گئی۔ اس لئے اردو کو ملکی زبان بنانے کی ہر سعی بیکار ثابت ہوگی ہندی
کافر کی زبان ہے۔ اس لئے ایک مسلمان اسے نہیں سیکھے گا۔ بلکہ میری رائے میں ہر ہندو اور مسلمان
کو دیوناگری اور فارسی ہر دو رسم الخط سیکھنے چاہئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طرح ہم جلد
ہی ایک مشترکہ زبان قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ مسلسل قواعد اور مارچنگ ایک پلٹن
میں سخت قسم کا اتحادِ عمل پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح مشترکہ زبان وحدتِ فکر پر منتج ہوتی ہے
لیکن یہ اتحادِ فکر و عمل معاشرتی و سیاسی اتحاد پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ جو ہندوستان میں ناپید ہے
ایک جرمن جب فرانسیسی زبان سیکھتا ہے تو اس کا ذہن فرانسیسی نہیں بن جاتا۔ کیونکہ دونوں
کی سیاست بالکل مختلف ہے۔ ہم ہندو مسلمانوں کی نہ صرف تاریخی روایات علیحدہ علیحدہ ہیں بلکہ
معاشرتی اعتبار سے بھی ہم ایک دوسرے کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہر دستور ہمارے
ہاں استثنیٰ بن جاتا ہے۔ اور صورتِ حال پریشان کن بن جاتی ہے۔ ہمارے سماجی تعصبات
نہ صرف ہماری سیاسیات کو پیچیدہ بنا رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے ہماری سیاسی زندگی دو نسخ

کا ایک نمونہ اور مشترکہ ملکی زبان کا مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بنا دیا ہے۔ کوئی بھی جھکنے کو تیار نہیں اس لئے کوئی تسلی بخش حل ممکن نہیں۔ مشترکہ زبان قائم کرنے کی ہر کوشش کو مخالفت کا سامنا ہو گا کیونکہ ہم ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہیں۔ ملک کے فلاح و امن کے ہر خواہاں کو دونوں رسم الخط سیکھنے چاہئیں۔ اپنی گرتی ہوئی صحت اور بڑھاپے کے باوجود میں نے ہندی کی ابتدائی کتابیں اب جیل میں پڑھی ہیں۔ اگرچہ میں اردو زبان کا دلدادہ ہوں۔ لیکن ہندی کا مطالعہ بھی مسرت آمیز ہے۔

زبان کے مسئلہ میں ایک اور پیچیدگی صوبائی زبانوں کی بھی ہے۔ اگرچہ پنجابی تمام پنجاب میں بھی نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن سکھ اسے ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو پنجابی کی سلجھی ہوئی اور شستہ شکل ہے لیکن سکھ اردو کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ تو ہندی کو بھی نہیں چاہتے۔ انہوں نے اپنا علیحدہ رسم الخط قائم کیا ہے۔ جو اگرچہ ہندی سے ماخوذ ہے۔ اس طرح اس ملک میں ایک زبان کی نہ صرف مختلف بولیاں ہیں۔ بلکہ ایک زبان میں کئی اور زبانیں موجود ہیں۔ ایک مشترکہ زبان ہندوستانیوں میں اتحاد کا ایک عنصر ہو سکتی ہے لیکن ہمارے ذمہ دار لیڈر اس سوال کو سلجھانے کے نا اہل ہیں۔ کانگرسی رہنماؤں کی تمام دیانتدارانہ مساعی زبان کے مسئلہ کو سلجھانے میں ناکام رہی ہیں۔ جب تک چھوت چھات کی لعنت دور نہیں کی جاتی۔ اور ہندو مسلمان بھائیوں کی طرح رہنا شروع نہیں کر دیتے۔ اس وقت تک کوئی ایک مشترکہ زبان قائم نہیں کی جا سکتی ہندو عوام اپنے آپ کو مسلمانوں سے ہر اعتبار سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اگر ہندو سیاستدانوں میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو ہندو و مسلمانوں میں بھائی چارہ دیکھنا چاہتا ہے۔ تو یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے۔ کہ ان میں ایک دوسرا عنصر ایسا بھی موجود ہے۔

جو پرانے نظام ہی کو قائم رکھنا چاہتا ہے مجھے ایک دفعہ ایک ہندو ٹرسٹ کے دفتر میں جانے کا موقعہ پڑا جب میں وہاں بیٹھا مینجر کا انتظار کر رہا تھا۔ تو مجھے دفتر کے ساتھ کے کمرے میں ایک لائبریری دکھائی دی جہاں کچھ لوگ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور کچھ کتابوں سے نوٹ لے رہے تھے میں نے انتظار کرنے کے بجائے لائبریری میں چل کر اخبار پڑھنے کا ارادہ کیا۔ جونہی میں اندر داخل ہوا سب کی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اُن سب نے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر میری اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کیا میرے دل میں فوراً یہ خیال آیا۔ کہ مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے لیکن کیوں؟ یکا یک میری نگاہیں ہر دیوار پر لٹکے ہوئے بورڈوں پر پڑیں جن پر جلی حروف میں "صرف ہندوؤں کے لئے" لکھا ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس ہندو دانی کا مقصد حیاتِ ہندو میں احساسِ برتری قائم رکھنا تھا۔ یہ ٹرسٹ شاید ہندوستان میں سب سے بڑا ٹرسٹ ہے جب ایک طرف قلب و دماغ کو یہ تربیت دی جا رہی ہو۔ تو زبان کے مسئلہ کو آسانی اور عجلت سے حل کر لینے کی کوئی توقع نہیں ہونی چاہیئے ہمیں منتظر رہنا چاہئیے کہ موجودہ عالمگیر جنگ کے بعد قدرت پردہ غیب میں سے ہمارے لئے کیا ظہور میں لاتی ہے۔

سیاسیات

معاشرتی، مجلسی اعتبار سے ہندو غیر رواداری ہیں لیکن ان کے رہنما سیاسی لحاظ سے دور بین اور وسیع القلب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو رہنما اپنی عادات کو بدلنے میں کچھ ہچکچا رہے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں اصلاح نہیں کی جا سکتی۔ یا وہ غیر ترقی پسند ہیں۔ وہ ہر تجویز کو سکون اور شانتی سے سنتے ہیں۔ اور مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں سیاسی اعتبار سے وہ بہت مخلص ہیں۔ اور قوم پرست بننے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہندو رہنما اپنے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں۔ تو اس کی وجہ ہندو عوام کا زبردست دباؤ ہے۔ ورنہ مسلم قوم کو ممنون کرنے کے لئے وہ کافی فراخ حوصلگی سے کام لینے پر آمادہ ہیں۔ ہندوستان کی فرقہ وارانہ سرپھٹول اور زیادہ ہوتی

لیکن ہندوؤں نے ملک کی خاطر جو مصائب برداشت کئے ہیں۔ ان کی بنا پر اُن مسلمانوں کا دل بھی نرم ہو جاتا ہے جو ہندو کے ناقابل برداشت مجلسی سلوک کی وجہ سے اُن سے طبعاً نفرت کرتے ہیں۔ ان ہندو رہنماؤں کی قربانیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ ان کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بنانے کے لئے کانگرس کے ماتحت ہندو اور مسلمان مخلص رہنماؤں نے کافی قربانیاں دی ہیں۔ لیکن ان کی مساعی بارآور نہیں ہوئیں کیونکہ انہوں نے ملکی مسئلے پر سائنٹیفک طریقے سے غور نہیں کیا۔

۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو رہنماؤں نے جداگانہ انتخاب کو برضا و رغبت تسلیم کر کے اس خلیج کو پاٹا جو مسلم لیگ کے قیام کی وجہ سے پیدا ہو چکی تھی۔ ہندو رہنماؤں کے اسی رویہ سے ہندو سرمایہ دار اور مسلمان امراء ایک دوسرے کے نزدیک تر ہو گئے۔ اگرچہ ہندو اور مسلمان آج بھی دو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ۱۹۱۶ء کے پیکٹ کے بعد حکومت کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ دونوں قومیں متحد ہو کر سرگرم عمل نہ ہو جائیں۔ اس معاہدے نے ملکی وقار میں اضافہ کیا۔

مہاسبھائی ذہنیت کے ہندو یہ کہتے ہیں کہ جداگانہ انتخابات ہی موجودہ جھگڑے کی جڑ ہیں لیکن اس سے قبل بھی ہم ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ملک میں ابھی تک ایسا کوئی رہنما پیدا نہیں ہوا۔ جو مختلف تعصبات کی جگہ ایک تعمیری جذبہ پیدا کر دے۔ سیاست اس چیز کا نام ہے کہ موجودہ حالات میں جو کچھ ممکن ہو انسان اپنی بساط کے مطابق کر گذرے۔ مجھے اُن کانگرسی لیڈروں کی شرافت قلب کا اعتراف ہے جو کبھی مایوس نہیں ہوتے اور ہر جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے ہمیشہ تن دہی سے کوشاں رہتے ہیں۔

نئی اصلاحات کے بعد مسلمانوں نے قدرتی طور پر مختلف ملازمتوں میں اپنی حق تلفیوں کی تلافی چاہی بیکن تعلیم یافتہ ہندو قوم بعض ملازمتوں کی اجارہ دار بنی بیٹھی تھی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے مطالبے کی سخت مخالفت کی۔ بنتہ ۱۹۲۲ء سے لے کر آج تک ہر سرکاری دفتر منافرت و مغائرت پھیلا رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان پریس ایک دوسرے پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور سر پھٹول بھی ہوتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان جو ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے ایک دوسرے سے پھر جدا ہو گئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جدائی مستقل حیثیت اختیار کر لے گی۔ کانگرسی رہنما اس واقعے سے گھبرا اٹھے۔ بنگال کے مشہور لیڈر مسٹر داس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جن ضلعوں اور میونسپل بورڈوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں مسلمانوں کو ملازمتوں میں ساٹھ فی صدی حصہ دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کلکتہ کارپوریشن میں مسلمانوں کا تناسب بڑھا دیا۔ مہاسبھا کے لیڈروں نے ان کے خلاف ایک طوفان بپا کر دیا لیکن وہ تاحینِ حیات تمام طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سفینے کو کھیتے رہے۔ مسٹر سری نواس آئنگر جو ۱۹۲۶ء میں کانگرس کے صدر رہ چکے تھے انہوں نے بعض دوسرے ہندو نیتاؤں کی طرح یہ سمجھا کہ ہندو مسلم مناقشے کی وجہ سیاسی ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ جاننا چاہا کہ اگر پورن سوراج مل جائے تو مسلمانوں کے مطالبات کیا ہوں گے۔ مسلم رہنما جن میں مولانا محمد علی مرحوم اور مسٹر جناح بھی شامل تھے دہلی میں اکٹھے ہوئے اور ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے چند بہت اعتدال پسند تجاویز مرتب کیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ انتخاب مخلوط ہو لیکن نشستیں آبادی کے مطابق مخصوص ہوں۔ یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ ہندو سبھا نے اس تجویز کو پسند نہ کیا۔ اور اسے ملتوی کر دیا گیا۔ ایک سال بعد ایک اتحاد کانفرنس اس مسئلے پر سوچ بچار کرنے کے لئے بلائی گئی۔

اس کانفرنس میں کئی مواقع پر مسٹر محمد علی جناح نے ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتے کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کے راستے میں ایک مشہور ہندو لیڈر حائل ہوتے رہے۔ یہ ہندو لیڈر بعد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن بنائے گئے۔ مسٹر جناح اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے مخلوط انتخاب کے سخت حامی تھے اور متحدہ قومیت کے علمبردار تھے۔ مگر اس اتحاد کانفرنس میں مذکورہ بالا ہندو لیڈر نے مسٹر جناح کو مشتعل کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے۔ ایک کی قیادت مسٹر جناح اور حمایت مرحوم علی برادران۔ ڈاکٹر انصاری اور دیگر قوم پرور مسلم رہنما کر رہے تھے۔ اس گروہ نے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد کیا۔ دوسرے حصے کی رہنمائی سر فضل حسین اور سر شفیع کر رہے تھے۔ اس گروہ نے اپنا اجلاس لاہور میں کیا۔ اول الذکر گروہ کے ساتھ ہندو رہنماؤں کی اشیرباد تھی اور ثانی الذکر کی پشت پر حکومتِ برطانیہ تھی۔ ایک مخلوط انتخاب کا علمبردار تھا۔ اور دوسرا جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر حقوق کا مطالبہ کر رہا تھا۔ کانگرسی رہنما برطانی سامراج کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے لئے بہت بے تاب تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھنؤ کے مقام پر ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائی تاکہ نہرو رپورٹ کے اصولوں پر ایک نیا فرقہ وارانہ سمجھوتہ مرتب کیا جا سکے۔ مسلم سیاستین یہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی حمایت حاصل کر کے سندھ کو بمبئی کے صوبے سے الگ کرایا جائے۔ ہندو سبھا نے اس تجویز کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ لیکن سندھ کے کانگرسی نمائندوں نے عجیب و غریب حقائق پیش کئے جو اس امر کے مظہر تھے کہ ہماری سیاسی پالیسیاں مرغِ باد نما کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔ ایک ہندو کانگرسی نے اس کانفرنس میں یہ واقعہ بیان کیا کہ کچھ سال پہلے ہندو فرقہ پرست سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور مسلم فرقہ پرست اس کے مخالف تھے۔ مگر اس کانفرنس میں صورت

حال بالکل برعکس تھی۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ تعصب کس طرح اپنا کام کر جاتا ہے۔ کانگریسی لیڈروں کو یہ تسلی تھی کہ مختلف فرقوں کے مطالبات میں کچھ بنیادی فرق نہیں ہے۔ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ پنجاب کا معاملہ ہمیشہ کٹھن صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ یہاں ایک تکونی جنگ شروع ہے۔ ہندو اور سکھ یہ چاہتے ہیں کہ ملازمتوں، میونسپل بورڈوں اور مجالس قانون ساز میں انہیں اپنے جائز حقوق سے زیادہ ملے۔ اور مسلمان اپنی معمولی اکثریت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا عقدہ لاینحل بن جاتا ہے۔ اس آل پارٹیز کانفرنس میں ہر صوبہ اپنے اختلافات کو خوش اسلوبی سے دور کرنے کا خواہشمند تھا۔ لیکن پنجاب نے اپنی ذہنیت، قابلیت اور رواداری کا نہایت گھناؤنا مظاہرہ کیا۔ آخر کار ایک سب کمیٹی میں جس میں سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا آزاد اور سروجنی نائیڈو موجود تھے۔ لالہ لاجپت رائے اور پنجاب کے دوسرے متصادم عناصر کو مخلوط انتخاب پر راضی کیا گیا۔ سکھوں نے سب سے پہلے اپنی منظوری دی۔ مسلمانوں نے بھی طوعاً و کرہاً مسلمانوں کی بات مان لی چنانچہ کانگریسی خلافتی اور اکالی کارکنوں نے پنجاب پیکٹ پر دستخط کر دیئے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ سکھوں نے اسی روز شکوک کا اظہار شروع کر دیا۔ دوسرے دن انہوں نے بلا کا احتجاج کیا۔ اور تیسرے روز اس پیکٹ کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ ہمارے لئے یہ امر اور بھی حیرانگی کا باعث ہوا۔ کہ تمام ہندو پریس نے سکھوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ سکھ ہمیشہ ہندو فرقہ پرستوں کے ہاتھوں میں کھیلے ہیں۔ اور بعض کانگریسی ہندوؤں کو بھی سکھوں سے ہمدردی ہے۔ مہاتما جی اور مالوی جی دونوں ہی نے پنجاب پیکٹ کے خلاف سکھوں کے احتجاج کی تائید کی۔ سکھوں نے اب یہ مطالبہ کیا کہ ان کی نشستیں آبادی

کے مطابق مقرر کی جائیں اور انہیں اس بات کی بھی اجازت دی جائے کہ مخلوط انتخاب کی سکیم کے ماتحت انہیں دوسری نشستوں پر بھی کھڑے ہونے کا حق ہو مسلمانوں کی اس صوبہ میں پہلے ہی صرف معمولی اکثریت تھی۔ اس لئے وہ اس تجویز کو نہ مان سکتے تھے۔ علاوہ ازیں مسلم عوام ہمیشہ مخلوط انتخاب کے مخالف رہے ہیں۔ جن مسلم کارکنوں نے پنجاب پیکٹ پر دستخط کئے تھے۔ انہیں ہدفِ الزام وملامت بنایا گیا۔ اور مسلمان فرقہ پرستوں نے ان پر سخت نکتہ چینیاں کیں۔ جن خلافتی کارکنوں نے دستخط کئے تھے انہیں بہت سے حملے برداشت کرنے پڑے لیکن انہوں نے اصلی پنجاب پیکٹ کی تائید میں پروپیگنڈا جاری رکھا۔ مگر کانگرس نے نہرو رپورٹ واپس لے لی۔ اور اس کے ساتھ ہی پنجاب پیکٹ بھی ختم ہو گیا۔ یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مخلوط انتخاب کے حامی مسٹر جناح نہرو رپورٹ میں چند معمولی تبدیلیاں چاہتے تھے لیکن گاندھی جی نہ مانے۔ اگرچہ نہرو رپورٹ دریائے راوی میں بہادی گئی تھی۔ تاہم خلافتی مسلمان مخلوط انتخاب کے حامی رہے لیکن اس وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ ڈاکٹر انصاری اپنی فریدپور کی تقریر میں سکھوں کے مطالبات ہی کی بنیاد پر ان سے سلسلہ جنبانی کریں گے۔ مسلم قوم پرور کارکنوں کے لئے یہ امر ناقابلِ برداشت تھا۔ اور اور انہوں نے ایک نئی جماعت مجلسِ احرار قائم کی۔ ہندو لیڈروں نے دل نہ چھوڑا۔ وہ ابھی تک کسی تسلی بخش سمجھوتے کے لئے کوشاں تھے۔ گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئے۔ مسلمان مخلوط انتخاب کو منظور کرنے پر تیار تھے لیکن سکھوں نے اب کے پھر اپنے جائز حقوق سے زیادہ مانگ کر مسئلے کو الجھا دیا۔ مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں کانگرس کے واحد نمائندہ تھے۔ ان میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ سکھوں کو ناجائز مطالبات پر ملامت کر سکیں۔ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے درخواست کی گئی کہ مختلف فرقوں کے مطالبات

کے متعلق وہ فیصلہ کر دیں۔ بدقسمتی سے ان کا فیصلہ غیر مسلم سیاسیین کے لئے سخت اضطراب کا
باعث ہوا۔ اور سکھوں نے خونریزی کی دھمکی دی۔ ایک اور اتحاد کانفرنس بلائی گئی۔ مگر اس کا
بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں
مسٹر جناح کو نہ بلایا گیا۔ کیونکہ وہ متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے سخت حامی تھے۔ میاں
سر فضل حسین ایک سیاسی شاطر تھے۔ بے پر کی اڑانے والے یہ کہتے ہیں کہ ملکی مفاد کو جو زبردست
نقصان پہنچا ہے۔ اس کی ذمہ داری میاں صاحب موصوف پر ہے۔ وہ ایک اعتدال پسند
ہونے کی وجہ سے ایک عملی انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جن لوگوں اور فرقوں کو اقتدار
حاصل ہو وہ شاذ و نادر ہی اس سے دستبردار ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے۔ کہ
ہندوستانی مسلمان اپنے حقوق کے لئے سخت جدوجہد کریں۔ کمیونل ایوارڈ (مسٹر ریمزے
میکڈانلڈ کا جداگانہ انتخاب کا فیصلہ) کے بعد انہیں پوری تسلی ہو گئی۔ اب وہ چاہتے تھے
کہ مخلوط انتخاب کی بنیادوں پر ہندوؤں اور سکھوں سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ انہوں نے
اور سر جوگندر سنگھ نے مخلوط انتخاب کے اصولوں پر ایک فارمولا تیار کیا۔ لیکن ہندو اور سکھ
رہنماؤں نے اسے ٹھکرا دیا۔ جب ہم خلافتی کارکنوں نے پنجاب پیکٹ کو منظور کیا تھا تو میاں
صاحب نے کہا تھا کہ ہماری مخلوط انتخاب کی سکیم مسلمانوں کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔
لیکن انہوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ہندو اور سکھ اس سکیم کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور
لگا دیں گے۔ انہیں چونکہ ہندوؤں اور سکھوں کی اس کمزوری کا پتہ تھا۔ شاید اسی لئے انہوں
نے خود مخلوط انتخاب پر مبنی ایک فارمولا تیار کیا۔ تاکہ ہندو اور سکھ اسے مسترد کر دیں۔ انہیں
پختہ یقین تھا کہ ہندو اور سکھوں کو یہ خدشہ ہے کہ مخلوط انتخاب کے ماتحت ان کی حیثیت بہت
گر جائے گی۔ اس لئے وہ اس سکیم کو آسانی سے منظور نہ کریں گے۔ بہر حال مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ

کے ذریعے توقع سے زیادہ ملا۔ اور اب میاں فضل حسین اس حیثیت میں تھے کہ دوسرے فرقوں کے تئیں عالی ظرفی ظاہر کریں۔ خواہ یہ عالی ظرفی ظاہری ہی ہو۔ جب مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے فرقہ وارانہ فیصلے کی خبر پہنچی۔ اسی وقت کانگریس اور احرار کے ضلع وار اور صوبائی عہدیدار ملتان جیل میں مقید تھے۔ مسلمان اس فیصلے پر خوش تھے۔ اور ہندو لال پیلے ہو رہے تھے۔ جیلوں سے باہر جو سکھ تھے انہوں نے صوبے میں خونریزی کی دھمکی دی۔ اور گورنر صاحب کے سامنے کمیونل ایوارڈ کی مخالفت کا حلف اٹھایا لیکن کانگریس ہائی کمان نے سکونِ قلب سے کام لیا۔ اور فرقہ وارانہ امن کو خطرے میں نہ ڈالا جونکہ فرقہ وارانہ مسئلے کا اس ایوارڈ کے علاوہ اور کوئی حل اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لئے کانگریس نے اسے آخری چارہ کار سمجھتے ہوئے منظور کر لیا۔ اور اسی ایوارڈ کے ماتحت وزارتیں قبول کیں۔ دور میں کانگریسی وزارتوں نے امتحان و آزمائش کے وقت بھی توازن و انصاف کی کوشش کی۔ انسان غلطیوں کا پتلا ہے لیکن کانگریسی حکومتوں کی برائیاں ان کی اچھائیوں سے بڑھ گئیں۔ یو۔پی میں خاکساروں پر پولیس نے جو گولی چلائی اس پر مسلم مقرروں اور اخباروں نے بہت سخت احتجاج کیا اس حادثے پر کوئی بھی معقول مسلمان اظہارِ تاسف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مسلم لیگی ممبرانِ اسمبلی نے یو۔پی کے کانگریسی وزیرِ اعظم پنڈت پنت کی سخت مذمت کی مسلم عوام کو یہ یقین دلایا گیا۔ کہ کہ خاکساروں کو کچل کر کانگریس مسلمانوں کے جذبہ مدافعت کو ختم کر دینا چاہتی ہے "یومِ خاکسار" منایا گیا مسلمان اخباروں نے خاکسار نمبر شائع کئے لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد پنجاب میں سر سکندر کی وزارت نے بھی کچھ انتقامی جذبے کے ماتحت کیا۔ ہر روز گولی چلتی۔ لاٹھی چارج اور پکڑ دھکڑ ہوتی۔ مسلم لیگ اس خونی ڈرامے کو نہایت خاموشی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہتا۔ کہ اتحادی وزارت جو مسلم لیگ کے زیرِ سایہ ہے مسلم قوم کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ رہی ہے

اگر مسلم پریس کبھی احتجاج کرتا بھی ہے تو اسے بہرے کانوں کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ اگر خاکساروں کا بھی قتلِ عام کسی کانگریسی صوبے میں ہوتا۔ تو آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیئے جاتے۔ یو۔پی کی جیلوں میں خاکساروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ انہیں شاہی قیدی سمجھا گیا لیکن یہاں پنجاب میں ان سے اخلاقی قیدیوں کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی کثیر تعداد معافیاں مانگ کر رہا ہو رہی ہے۔

کمیونل ایوارڈ کے باوجود اب لیگی راہنما ہندوستان کی دو حصوں میں تقسیم چاہتے ہیں انہیں یہ پکا یقین ہے کہ ہر بڑے سے بڑے مطالبے کے لئے انہیں مسلم عوام کی تائید حاصل ہو جائے گی۔ چونکہ ہندو ہمسایہ کا سلوک تسلی بخش نہیں اس لئے مسلم عوام جان کی بازی بھی لگانے کو تیار ہیں۔ ہندو ساہوکار اپنے مسلمان آسامی کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے۔ اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں وہ مسلمان کو اچھوت سمجھتا ہے۔ اس لئے مسلم عوام ہندوؤں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا چاہتے ہیں۔ وہ کانگریسی لیڈروں کی کشادہ قلبی کی داد نہیں دیتے۔ چونکہ وہ کسی ہندو میں بھی فراخ حوصلگی کا عشرِ عشیر نہیں پاتے۔ اس لئے وہ ہندو سیاستین کے ہر جذبے کو تعصب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ وہ روزمرہ کے سلوک کی تلافی چاہتے ہیں جو انہیں ہندو سے فساد پر ابھارے۔ وہ اسے اپنا ناجی سمجھتے ہیں جو انہیں صلح و امن کا پیغام دے۔ وہ اسے مسلم قوم کا غدار سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہندو مصیبت زدہ حیوان سے تو ہمدردانہ سلوک کرتے ہیں لیکن ایک مظلوم انسان اگر مسلمان ہو تو انہیں اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔"

مسلمان کو اچھوت اور ملیچھ سمجھنے کا رویہ دن بدن ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے۔ اگر ایک دفعہ ایک قوم کو اپنی بے عزتی کا احساس ہو جائے تو ہوشیار لوگ انہیں انتہائی اقدام پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ پرست کامیاب اور ہندو مسلم اتحاد کا داعی ناکام ہو رہا ہے۔ جو

آوازیں پہلے مدھم ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مسلمان اب اپنے تاثرات کے اظہار کا طریقہ سیکھ رہا ہے۔ میرے ساتھ آج کل راولپنڈی جیل میں ایک کٹر قوم پرست مسلمان بھی محبوس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "دشمن ملک کے قیدیوں کے ساتھ وہ برا سلوک نہیں کیا جاتا جو مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔ اسی جیل میں چند جرمن بھی نظر بند ہیں۔ ہمارے سپرنٹنڈنٹ جیل ایک برطانوی فوجی افسر ہیں۔ انہیں ان جرمنوں کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانے میں کوئی تامل نہیں لیکن ہم ہندو مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ اور دونوں ہی غلام ہیں۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے ساتھ دشمنوں سے بھی برا سلوک کرتے ہیں۔ اس صورت حال پر پھر کانگریس کو غور کرنا چاہیئے۔" لیکن کانگرس نئے نئے راستے اختیار کرتی ہے۔ کانگریسیوں نے مجالسِ رابطہ عوام بنائیں۔ جو بے جان لاشے ہیں۔ یہ کمیٹیاں جلد ہی ناکام ہو گئیں۔ کیونکہ ہندو مسلمان کے ساتھ ملنے سے ڈرتا ہے۔ اس معاملے پر کانگرس چپ سادھے ہے اور ہندو کے قلب سے تعصبات دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ کانگرس نے اچھوت ادھار کی تحریک شروع کر رکھی ہے۔ لیکن اس تحریک کا مسلمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کم از کم میں نے تو آج تک کسی کانگریسی کو ہندو کی مذمت کرتے نہیں دیکھا۔ کہ وہ مسلمان کے ساتھ کیوں اتنا ذلیل سلوک کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو کانگرس کے چونی والے ممبر بنانے کا مطلب مسلم عوام سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اگر گاندھی جی آج حکم دیں کہ کانگرس کے ہندو ارکان مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھائیں تو مجھے پختہ یقین ہے کہ ان کی پچانوے فی صدی تعداد کانگرس کو چھوڑ دے گی۔ اس وقت تک رابطہ عوام کے کیا معنی ہیں۔ جب تک مسلمان کانگریسی کے صرف چھونے ہی سے اس کا ہندو کانگریسی بھائی بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ رابطہ عوام کی یہ تحریک ایک منافقت ایک طلسم اور ایک دھوکہ معلوم دیتی ہے۔

اسی قید خانہ میں میرے ایک نوجوان ہندو ساتھی نے مجھے اپنا تجربہ سنایا جو سبق آموز ہے وہ اپنے دوسرے کانگرسی رفقاء کے ساتھ دیہاتوں میں تقریریں کرنے اور ممبر بنانے کے لئے گئے مسلمانوں نے حسب معمول کوئی توجہ نہ دی۔ پانی پینے کے لئے وہ ہندو نوجوان مسلمان کے گھر میں داخل ہوا۔ وہاں ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اس نوجوان سے پوچھا کہ تم کون ہو اس نے جواب دیا کہ میں ہندو برہمن ہوں۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ مسلمان کی چھوئی ہوئی چیز ہندو کبھی بھی استعمال نہیں کرتے۔ نوجوان نے جواب دیا کہ اماں! میں ایسا ہندو نہیں ہوں میں تو ایکتا چاہتا ہوں۔ یہ واقعہ سن کر میں نے جیل کے اپنے اس نوجوان رفیق سے کہا کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور جو مسلمانوں کو اچھوت سمجھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے

ہر ہندو دیش بھگت جو اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہے۔ اسے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیئے میں اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ جب مسلم عوام کسی مسلمان قوم پرست کو ہندو قوم پرست کے دوش بدوش سرگرم عمل دیکھتے ہیں تو وہ فوراً نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ چند روپوں اور ٹکلیوں کے عوض اس مسلمان نے اسلام سے غداری کی ہے۔

ہندو تاریخ اور انسانیت کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے ہی ملکی بھائیوں کے گلے کاٹے ہیں کیسی کتنے یا چلپاسہ کا خراب کیا ہوا پانی ناپاک تو نہیں ہوتا جتنا کہ ایک مسلمان یا شودر کا چھوا ہوا پانی۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ بعض ہندو اچھوت ادھار کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا۔ اس اچھوت ادھار کی تحریک کی وجہ صرف یہ ہے کہ مہاسبھائی لیڈر صرف یہ چاہتے ہیں کہ آئینی جنگ لڑنے کے لئے تعداد کا غلبہ حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو ان اچھوتوں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے لیکن ہندو جب تک اپنی ذہنیت نہیں بدلتا

اس وقت تک نہ یہ تحریک اچھوتوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔ اور نہ ان کے خطرے کو دور کر سکتی ہے۔ انسانیت کے وقار کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے جو اندھی جہالت پیدا ہوتی ہے۔ وہ ذات پات کے تعصبات کا باعث بنتی ہے۔ اگر انسانیت کے وقار کا احساس پیدا ہو جائے تو ہندوستان امن کی جنت بن جائے۔ کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ چھوت چھات کی لعنت کو دور کرنے کے لئے کانگریسی لیڈر ہمت سے کام لے کر مسلمانوں کا ساتھ دیں گے؟ میرے کانگریسی دوست اس سلوک کے خلاف تو آواز بلند کر رہے ہیں جو شودروں سے کیا جاتا ہے لیکن اس سلوک کے خلاف کوئی بھی نہیں بولتا جو ہندو مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں جب میں اس صورت حال کو دیکھتا ہوں تو ان کانگریسی دوستوں کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں کیا میرے یہ دوست مسلمان کے ساتھ اس سلوک پر اندرونی طور پر فخر تو نہیں کرتے ہیں کیا وہ اس صورت حال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں؟ اس خیال سے مجھے کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ مسلمان کی سیاسی بیداری اس کے کام آئے گی لیکن قومیت متحدہ کے نظریے کا کیا بنے گا؟ یہ نظریہ چند سیاستدانوں کا سیاسی حربہ ہے۔ یہ ہندو اور مسلم عوام کے لئے بے معنی سی چیز ہے۔ بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو جلد ہی لوگوں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر دے گی۔ اور متحدہ قومیت کے قیام کا باعث ہوگی میری بھی خواہش یہی ہے۔ مگر مجھے کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں۔ یہ نیا دور جلد نہیں آ جائے گا۔ صدیوں کی بیماری دس بیس سالوں میں دور نہیں ہوسکتی۔ کانگرس میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو چھوت چھات کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ چیز صحت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ میں نے بعض بڑے بڑے ہندو کانگریسیوں کو دیکھا ہے۔ کہ وہ پانی کا گلاس اپنے سر سے اوپر لے جاتے ہیں اور اپنے چہرے آسمان کی طرف کر کے اپنے منہ کھول دیتے ہیں۔ اور ایک خاص انداز

سے اپنے حلقوں میں پانی انڈیلتے ہیں۔ وہ اسے بھی صحت کے اصولوں کے مطابق گردانتے ہیں لیکن میں اسے خبط قرار دیتا ہوں۔ ہم میں سے کون سچا ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ میں مالویہ جی کے ساتھ دہلی جیل میں رہا ہوں۔ وہ ایک رحم دل اور دوسروں کا لحاظ کرنے والے انسان ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک اڑیل برہمن ہیں مسلمان کا تو ذکر ایک طرف رہا وہ کسی ہندو کا سایہ بھی اپنے چوکہ میں دیکھنا نہیں چاہتے۔ پریذیڈنٹ پٹیل ایک زندہ دل انسان تھے۔ انہیں پنڈت جی کی اس کمزوری کا علم تھا۔ اور وہ ان کے کھانے کے وقت انہیں ملنے کو جاتے پٹیل جی سورج کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے کہ ان کا سایہ مالوی جی پر پڑتا۔ اور یہ دانشمند برہمن ایک طیش میں آئے ہوئے بچے کی طرح اپنے چوکے سے باہر کود پڑتا اور پریذیڈنٹ پوچھتے کہ پنڈت جی کیا معاملہ ہے؟

ایک مسلمان کے لئے ہندو سوسائٹی کا ماحول کتنا تنگ ہے۔ کسی ہندو کو اس کا خیال تک بھی نہیں آسکتا جب تک ہم چھوت چھات کے دیو کو چکنا چور نہیں کر دیتے۔ اس وقت تک ہندوستان جو جنتِ ارضی ہے۔ فرقہ وارانہ کشمکش کی وجہ سے جہنم بنا رہے گا ہمیں منافقانہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ اور صاف صاف یہ اعتراف کرنا چاہئیے۔ کہ جب تک چھوت چھات باقی ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مجلسی رابطہ پیدا نہیں ہوسکتا میں جانتا ہوں کہ مسلمان کو دھوکا دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور صرف شودروں کا ادھار کرکے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بدقسمتی سے بعض ہندو جذبات میں اتنے بہہ گئے ہیں کہ منطق و استدلال ان پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا لیکن مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی روز ملک میں صحیح احساس ضرور پیدا ہوگا۔ مگر یہ دن بہت دور دکھائی دیتا ہے ایک مسلمان کی حیثیت سے میں کانگرسی لیڈروں کا ممنون ہوں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے لئے تیار ہیں لیکن جب تک مسلمانوں پر سے مجلسی قیود دور نہیں کی جاتیں کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں

ہوسکتی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مسلمان چھوت چھات کی اذیتوں اور ہندوؤں کے مجلسی بائیکاٹ کو بری طرح محسوس کر رہا ہے۔ ہندو سے لڑنے کے لئے وہ ہر وقت موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن سے جو سلوک کیا جا رہا ہے۔ اُس نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے جن لوگوں نے مسلمانوں کو دبائے رکھا ہے جب تک مسٹر جناح اُن کے خلاف برسرپیکار رہنے کا وعدہ کرتے ہیں اُس وقت تک تو وہ مسلمانوں کے محبوب قائد ہیں۔ اور جونہی انہوں نے ہندوؤں سے کوئی سمجھوتہ کر لیا۔ انہیں بھی غدار سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتے گا مسلمانوں کی قیادت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ انہیں ہندوؤں کے ساتھ مستقل طور سے متصادم رکھا جائے۔ غربت کی زندگی اور ہندو کے ہاتھوں رذیل سلوک نے انہیں بیباک کر دیا ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ افلاس اور رذیل سلوک قلب کو تنگ اور ذہنیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ مسلمان اپنے مصائب کا باعث ہندو کو سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دن تو اپنے رہنما کو زندہ باد" کے نعروں سے آسمان تک اُٹھا دیتے ہیں لیکن دوسرے ہی دن جب وہ ہندوؤں کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ دیکھتے ہیں تو اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں۔

تین قومیں

اس ملک کی فضا پر مجھے نہ چھو کا جذبہ مسلط ہے۔ ایسے ماحول میں قومیت کا جذبہ باقی رہنا ناممکن ہے۔ خشک گھاس کے انبار میں سے ایک سوئی تو تلاش کی جا سکتی ہے لیکن ہندوستانی عوام میں قومی جذبات کا کھوج نہیں لگ سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف مشترکہ غلامی ہی کے رشتہ نے انہیں اکٹھا کر رکھا ہے۔ ورنہ ان کے اتحاد کی تہ میں کوئی اخلاقی قوت کارفرما نہیں ممکن ہے میرے ان خیالات کے مدِنظر مجھے مسٹر جناح کا ہم مشرب اور ہندوستان اور ہندوستانیوں کا بدخواہ قرار دیا جائے۔ اگر اس خیال سے کسی شخص کو راحت نصیب ہوتی ہو۔ تو اُسے میں اس خیال سے باز رکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن صداقت کو زیادہ دیر تک چھپائے نہیں رکھا جا سکتا۔ ضرورت ہے حقائق آشکار کیئے جائیں۔ تاکہ ملک کو جو خطرہ درپیش ہے ہمارے سیاسی لیڈر اس

سے آگاہ ہو جائیں ہماری فلاح اس چیز میں مضمر نہیں کہ ہم ایک قوم ہیں یا دو۔ آخر ہم قومیت کے لئے اتنے رطب اللسان کیوں ہوں؟ قومیت بھی فرقہ پرستی کی طرح ایک لعنت ہے۔ قومیت اور فرقہ پرستی دونوں کے جذباتِ قلب کو ناکارہ اور انسان کو متعصب اور اندھا بنا دیتے ہیں اقتدار کی ہوس اور احساسِ برتری اسی جذبۂ قومیت کے نتائج ہیں۔ پہلے قومیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر فخر و غرور کا احساس نمودار ہوتا ہے۔ یہ چھوت چھات اور ذات پات آخر ہیں کیا؟ غرور و تکبر کو مذہب کا جامہ پہنایا ہوا ہے۔ ایک کہتا ہے میں اپنے ملک کی حمایت کروں گا خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ اسی طرح دوسرا کہتا ہے "میں اپنی قوم کا حامی ہوں خواہ وہ سچائی پر ہو یا جھوٹ پر" ایک اور شخص بول اٹھتا ہے "میرا فرقہ میرا ہے خواہ وہ راستی پر ہو یا ناراستی پر" یہ تنگ نظری حقیقت میں اس کوتاہ بیں تہذیب کی پیداوار ہے جس نے اس وقت دنیا کو خاک و خون میں رُلا رکھا ہے۔ یہ جذبات اس تنگ نظر تمدن کی پیداوار ہیں جس نے آج دنیا میں خونریزی کا میدان گرم کر رکھا ہے۔ ان تفرقوں کو ختم ہونا ہوگا۔ لیکن میں بین الاقوامیت کو بے عملی کے لئے ایک آڑ بنانا نہیں چاہتا۔ اور نہ اسے غیر ملکی اقتدار کی حفاظت کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اول خویش بعدہٗ درویش کا اصول تو درست ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ دور افتادہ ہمسایہ کے خلاف سازش کرنی چاہیئے یا خود کو اپنے قریبیوں سے بڑا سمجھنا چاہیئے قومیت کے جذبہ نے کمزور اقوام کو ادبار کے گڑھے میں گرا دیا ہے۔ قومیت کی یہی انتہائی شکل ہندوستان کی چھوت چھات کی ذمہ دار ہے۔ جرمن قوم پرستی نہ جانے کتنے لاکھ انسانوں کی بھینٹ لے چکی ہے لیکن جو سلوک ہندوؤں نے شودروں سے روا کر رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ہندو سب سے بڑے گنہگار ہیں مسلمانوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے ہم احرار قومیت کے لئے نہیں بلکہ بین الاقوامیت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمیں

نہ صرف ہندوستان کی غربت و بدقسمتی کا احساس ہے۔ بلکہ ہمارے مدنظر تمام بنی نوع انسان کی غربت و نکبت ہے۔ فرقہ پرستی، قوم پرستی اور ذات پات مجلسی و سیاسی بیماریوں کے نام ہیں صرف ہمدردی سے ان کی تلافی کی جاسکتی ہے۔ اور ہمیں اسی فرض کو مقدم رکھ کر ادا کرنا ہے۔ چنانچہ ہماری توجہات کا زیادہ تر مرکز ہندوستانی عوام کی سیاسی نجات ہے۔ میں ہندوستانیوں کو ایک قوم تصور نہیں کرتا لیکن پھر بھی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی خدمت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ہندو میرے پڑوسی ہیں۔ اور ہم دونوں ایک ہی قسم کے سیاسی ماحول میں زندگی گذار رہے ہیں۔ مگر مجھے اچھوتوں سے زیادہ ہمدردی ہے۔ مجھے ان کی حالت پر بہت زیادہ ترس آتا ہے۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ہندوستانی ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوم پرستی اگرچہ افتراق کا باعث ہوتی ہے۔ تاہم ایک بہت بڑے گروہ میں ایک ہی قسم کے خیالات اور بھائی چارہ پیدا کر دیتی ہے۔ مگر ہندوستان میں تو انانیت کا انتہائی جذبہ ہر طرف چھایا ہوا ہے ہر کوئی دوسرے کو اپنے ماتحت سمجھتا ہے۔ کوئی منظم نظریہ موجود نہیں، کوئی قومی افتخار کا احساس نہیں۔ ذات پات کے تعصبات رائج ہیں۔ ان حالات میں بھی جو لوگ ہندوستانیوں کو ایک قوم گردانے کی جسارت کرتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ صرف جغرافیائی وحدت ہی تمام باشندوں کو ایک قوم نہیں بنا دیتی۔ ہندوستان میں تین قومیں ہیں۔ پونزٹ ہندو، اچھوت اور ان دونوں کے درمیان مسلمان قوم ہے۔ اس خطرہ سے کہ کہیں انہیں وطن دشمن نہ قرار دیا جائے کچھ لوگ اس مسئلہ پر اپنی حقیقی رائے کے اظہار میں تامّل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ حقائق سے آنکھیں نہیں موندتے اور موجودہ حالات کے متعلق صائب رائے رکھتے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ہندوستان میں دو نہیں بلکہ تین قومیں بستی ہیں ــــ یعنی ہندو مسلمان اور شودر ــــ صرف یہ کہہ کر اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ صدیوں کے تعصبات

چند سالوں میں دور نہیں ہو سکتے۔ یہ سچ ہے کہ سارا ہندوستان کسی نہ کسی روز ایک قوم بن جائے گا۔ مگر ہمیں اس کی فوری توقع نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہم نے سماجی اتحاد کے لئے کوئی سنجیدگی سے کوشش کی ہی نہیں۔ قومی یکجہتی سے پہلے سماجی اتحاد ضروری ہے۔ کیا ہم یہ دعا کریں کہ کوئی متشدد انقلاب ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے سماجی نظام کو تباہ اور دیرینہ تعصبات کو دفن کر دے؟ ہماری نجات کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ ارتقائی طریقوں سے تو ایک معقول مدت میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، اور ہم تین مختلف گروہوں ـــــ ہندو، مسلمان اور شودر ـــــ ہی میں بٹے رہیں گے۔ انقلاب کی اس دعا کی تہ میں اقتصادی انصاف کی خواہش کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ امرا کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اور وہ غریبوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے رہیں گے۔

اگر ہندوستان میں سماجی اور اقتصادی اصلاح کرنا ہے۔ تو یہ امر ہمیشہ زیرِ نظر رہنا چاہیئے کہ ہندوستان میں خرابیاں مذہب کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ہندوستان کی ایک کثیر آبادی کے "مجھے نہ چھوؤ" کے جذبہ کا نتیجہ ہے موجودہ زمانہ میں ایک عامی مسلمان کے خیالات پیغمبر خدا کے خیالات کے عین مطابق نہیں۔ بلکہ شہنشاہِ اکبر کے دینِ الٰہی سے ماخوذ ہیں۔ اور اکبر کا یہ دین اس کے ہندو مشیروں کی صلاح و مشورہ کا نتیجہ تھا۔ آج کے مسلمان کے مذہب کی روح سناتن دھرمی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کا مرکز رسولِ کریم ہیں۔ اور ہندو رام اور کرشن کے پجاری ہیں بعض ہندو دوست اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ مسلمان ایک مذہبی فرقہ ہیں۔ اور دوسرے فرقوں کی نسبت ان پر مذہبی لوگوں کا زیادہ اثر ہے۔ مگر حقیقت اس کے الٹ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندو عوام کی رہنمائی مذہبی لوگ کر رہے ہیں۔ مہا سبھائی طبقہ کے رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ جی ہیں۔ اور کانگرسی گروہ گاندھی جی کا پیرو ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ دونوں اصحاب مذہبی ہیں۔

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مسٹر جناح ایک مذہبی بزرگ ہیں۔ اس کے دماغ میں خرابی ہے مسلمان مذہب کے زیرِ اثر نہیں۔ ہندوؤں کے خلاف اس کا تعصب کسی مذہبی جذبہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ اس سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ کا ردِ عمل ہے جس کے ذریعے ہندوؤں نے مسلمانوں کو پستی میں گرا رکھا ہے۔

(۲)

اگر ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم سے تعلق نہیں رکھتے۔ تو یہ کوئی نقصان کی بات نہیں۔ وہ امن و امان سے رہنا سیکھ لیں تو انہیں ہر قسم کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ تاریخ سماجی رواج اور زبان کا اختلاف ہماری ترقی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس چیز کا احساس ہے کہ ذات پات اور چھوت چھات کے تعصبات جلدی دور نہیں کیئے جا سکتے۔ لیکن ان کے نتائج سے بچا جا سکتا ہے۔ اگر مسلمان ہندو سے مساوی مجلسی سلوک کی امید رکھنے کے بجائے اپنی قوم میں اتحاد و تعاون شروع کریں۔ تو چند سال ہی میں صورتِ حال بہتر ہو سکتی ہے انہیں تمام ہندو قوم کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور نہ سب ہندوؤں کو ناپاک اور نجس سمجھنا چاہیئے بلکہ انہیں یہ سلوک صرف مغرور ہندوؤں کے ساتھ روا رکھنا چاہیئے۔ اور جو ہندو مسلمانوں کو اچھوت نہیں سمجھتے مسلمانوں کو ان کے ساتھ کھانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے دونوں قوموں کے تعلقات پر اچھا اثر پڑے گا۔ ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ جو اکٹھا کھانے کو برا نہ سمجھیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کا مستقبل درخشاں اور موجودہ زمانہ میں ان کا وقار محفوظ ہو جائے گا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی اس روش پر بھی بعض ہندو بھائیوں کو اپنے اس سلوک پر شرم نہیں آئے گی جو وہ مسلمانوں سے کر رہے ہیں۔ اور وہ ہمیں فرقہ پرست اور جنونی قرار دیں گے لیکن ہمیں اسے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے۔ یہ مدافعانہ اقدامات ملک کے امن میں

مخل نہیں ہوں گے۔ یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ ہمارا یہ طرزِ عمل عارضی ہے۔ اور اس سے غرض صرف یہ ہے کہ ہم چھوت چھات کے مضر اثرات سے مامون ہو سکیں۔ یہی طریق کار شودروں کو اختیار کرنا چاہیئے لیکن وہ ادھ موئے ہو چکے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کی روح سلب کر رکھی ہے۔ میں اس سے پہلے بھی انہیں جرأت سے کام لینے کا مشورہ دے چکا ہوں لیکن میرا مشورہ کون کو ہے۔ شودروں کو۔ ہم نے تو ان کی روح کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ اور اب وہ ہم سے نفرت کرنے اور انتقام لینے کے ناقابل ہیں حکومتِ برطانیہ نے اپنی اغراض ہی کے لئے سہی۔ جداگانہ انتخاب کا حق شودروں کو دے کر ان کے تنِ مردہ میں زندگی کی لہر دوڑانی چاہی تھی۔ مگر قسمت کا فیصلہ اس کے خلاف تھا غریب لوگ بغیر کسی دوسرے کی مدد کے اپنے پاؤں پر زیادہ عرصہ تک کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اور مجھے یہ یقین ہے کہ اس امداد کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ان کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تکلیف کا تو احساس ہے لیکن شودروں کی تکلیف سے وہ بے اعتنائی برت رہے ہیں غربت ایک مصیبت ہے لیکن چھوت ایک خوفناک عذاب ہے ہم نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر ان کی حالت اور تباہ و برباد کر دی ہے مسلمان یہ تو چاہتے ہیں کہ ان سے چھوت نہ کی جائے۔ لیکن وہ اس دھبّے کو شودروں پر سے دور کرانے میں نیم دلی سے بھی کوشش نہیں کرتے۔ میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا۔ کہ وہ شودروں کے ساتھ مل کر اپنے اس مشترکہ مقصد کے لئے جدوجہد کریں۔

پہلے تو شودروں کی طرف دستِ تعاون و امداد بڑھاؤ۔ اور ہندوؤں سے وہی سلوک کرو۔ جو وہ ہم سے کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم اس ملک میں امن کے ساتھ زندگی گذار سکیں گے۔ جب تک ہندو سماج میں بین الاقوامی جذبہ یا انسانی ہمدردی کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تک مسلمانوں اور شودروں کو مذکورہ بالا مدافعانہ اقدام جاری رکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ چھوت چھات کے

مضر اثرات سے محفوظ رہ سکیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے سب لوگوں کو اکٹھے جینا اور اکٹھے مرنا ہے لیکن ہندوؤں نے اپنے آپ کو تعصبات کے سپرد کر رکھا ہے۔ اور وہ خود کو دوسروں پر نہ صرف ذہنی و اخلاقی فوقیت دیتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کو ناپاک اور اپوتر بھی سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سیاستین کو آہستہ روی میں ماہر ہونا چاہیئے۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی رہنما تو اچھوتوں کے لیئے صحیح طور پر جدوجہد کرنا ہی نہیں چاہتے۔ انسان یہ دیکھ کر آگ بھبوکا ہو جاتا ہے۔ کہ ہندو، مسلمانوں کو اچھوت اور ہندو مسلمان دونوں ہی شودروں کو اچھوت سمجھتے ہیں مسلمانوں اور شودروں کی خاموشی کو رضامندی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ دونوں قوموں کو اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیئے۔ ہر شخص اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ دوسروں سے برا سلوک کرنے والوں کو یہ بتادو کہ ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اس لئے یا تو اپنے رویّہ کی اصلاح کرو۔ ورنہ ہم خود جوابی تعاون کے ذریعے اس چھوت چھات کو ختم کر دیں گے۔ یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ صرف کانگریسی لیڈروں کے پرچار سے سماجی اصلاح نہیں ہو سکتی خود اچھوتوں کو بھی اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لئے سعی کرنی چاہیئے جب تک ہندوستان کے سب لوگ مساوی سماجی درجہ حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک ان کا سیاسی مستقبل دھندلا ہی رہے گا۔ حب الوطنی کا یہ تقاضا ہے کہ جو لوگ اپنے کو اونچی جاتی کے اور دوسروں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ ان سے غیر متشدد عدمِ تعاون کیا جائے جب تک ان لوگوں کے ہوش ٹھکانے نہیں آتے۔ اور وہ اپنی ضد نہیں چھوڑتے۔ اس وقت تک یہ ہمارا فرض ہے کہ اس لعنت کو دور کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہیں مسلمانوں ہندوؤں کے ساتھ جوابی تعاون کا رویہ اختیار کر سکتے ہیں! اور اس طرح تھوڑے سالوں ہی میں وہ بہت طاقت حاصل کر سکیں گے! اور پھر انہیں ہندوؤں کے خلاف موجودہ شکایات نہیں رہیں گی مسلمانوں کی موجودہ کشمکش مذہبی یا سیاسی نہیں بلکہ سماجی اور

اقتصادی ہے۔ اس لئے اس مرض کو دور کرنے کے لئے جوابی تعاون کا آغاز درست ہے۔ اس جوابی تعاون کا مطلب یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کے ساتھ کھایا جائے جنہیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں کوئی اعتراض نہ ہو اور جو لوگ تمہیں نجس اور ناپاک سمجھیں۔ ان کے ہاتھ کی تم بھی کوئی چیز نہ کھاؤ۔ ہر قسم کی سیاسی جدوجہد کا انجام ہندو مسلم فسادات میں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندو اور مسلمان مجلسی طور پر متحد نہیں ہیں۔ یہ دونوں قومیں تھوڑے ہی عرصہ میں دوست بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ مسلمان میری تجویز پر عمل کریں یا ہندو چھوت چھات کو ختم کر دیں۔ جوابی تعاون ایک آسان فعل ہے۔ مگر ہندوؤں سے اس عادت کو جو ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے ترک کرنے کی توقع کرنا بہت زیادہ مشکل ہے۔

چھوت ایک افادی توہم پرستی ہے۔ اس نظریہ کا فائدہ صرف انہیں کو ہے جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو اچھوت اور نجس سمجھا جاتا ہے۔ یہ رسم ان کی اقتصادی ثروت کو سلب کر لیتی ہے اونچی جاتی کے لوگ اچھوتوں سے شاذ و نادر ہی کوئی چیز خریدتے ہیں۔ اس طرح وہ ان سے تجارتی مقاطعہ کر کے ان میں اقتصادی جمود پیدا کر دیتے ہیں۔ اعلیٰ جاتی کے ہندوؤں کے تعصبات بھی خوب ہیں۔ وہ کبھی یہ سوال نہیں کرتے کہ گھی کو مسلمانوں یا شودروں نے تو نہیں چھوا۔ دودھ جب تک اُبلا ہوا نہ ہو۔ اس وقت تک شودر کے چھونے کے باوجود بھی پاک رہتا ہے۔ اس طرح اس پاگل پن میں بھی اپنے لئے چند راستے بنا لئے گئے ہیں۔ اونچی جاتی کے لوگوں کی روش ہمیشہ یہی رہی ہے۔ کہ دوسروں کو ہر وقت دباتے رکھیں۔ مگر اس کام کے لئے خود بہت کم تکلیف اٹھائیں۔ دوسروں کو اچھوت قرار دے کر رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مادی فوائد بڑھتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی حیثیت بھی اس طرح گھٹ گئی۔ اگر مسلمانوں اور شودروں نے ان ہندوؤں کی ذلیل ذہنیت اور افادی تعصبات کو ختم کرنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا تو وہ کتوں کی زندگی بسر کرینگے

جو لوگ اپنے ہم وطنوں کو برابر نہیں سمجھتے ان کا دماغ درست کرنے کے لیئے صرف جوابی تعاون ہی ایک موثر حربہ ہے۔ چند سال ہی میں مسلمانوں نے سیاسی میدان میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن ابھی تک اقتصادی میدان میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں مسلمانوں کو دولت سے محبت کا مشورہ نہیں دیتا۔ انہیں اقتصادی انصاف کی بنیادوں پر ایک نیا نظامِ عالم قائم کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی حالت سدھارنے سے ہماری حالت بھی سدھر جائے گی۔ مسلمان نوجوانوں کو فوراً ان جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیئے جو بہتر سماجی نظام قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اگر مسلمان کمربستہ ہو کر فوراً جوابی تعاون شروع کر دیں اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹائیں جو پُرامن ذرائع سے پُرانے اقتصادی نظام کو بدلنا چاہتے ہیں تو صرف اسی صورت میں اس ملک میں امن کا دور دورہ ہو گا۔ اور یہ زمین ہم سب کے لیئے جنت بن جائے گی۔ ہندو بُرے لوگ نہیں ہیں۔ وہ امن پسند ہیں۔ اور ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔ اگر ان سے چھوت چھات چھڑا دی جائے۔ تو وہ یقیناً اچھے ہمسائے ثابت ہو سکتے ہیں۔ میری رائے پر بہت سے مسلمان بھنّا اٹھیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندو اپنی تنگ نظری کو نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مفاد اُن لوگوں کی موجودگی میں محفوظ نہیں رہ سکتے جن کا مفاد مسلمانوں کے نقصان میں ہے۔ اور جنہوں نے سالہا سال سے مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں کوئی قنوطی نہیں ہوں۔ مجھے یہ یقین ہے کہ پرانے نظام کی جگہ نیا نظام قائم ہو جائے گا۔ اور ہندوؤں کا سماجی نقطۂ نگاہ یقیناً وسیع ہو جائے گا لیکن ہمیں وہ دن قریب لانے کے لیئے ہر ممکن سعی کرنی چاہیئے۔ پاکستانی تجویز کی ہر دلعزیزی کا راز ہندوؤں کے سلوک میں مضمر ہے۔ اگر ہندو اپنے رویہ میں اصلاح کر لیں تو اس ملک میں پاکستان کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہے گا۔

بعض علما پاکستان کی اس وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے ان کا تبلیغی دائرہ محدود

ہو جائے گا، مگر مسلمان اس اعتراض کو چنداں وقعت نہیں دیں گے کیونکہ اس وقت تک اُن کی تبلیغی مساعی صفر رہی ہیں۔ ان کی ایک فی صدی تعداد نے بھی اپنے گھروں کے بھنگیوں کو اپنے برابر نہیں سمجھا۔ اس صورت میں ملک کے طول و عرض میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ مسلمان علانیہ اپنے مصائب کی وجہ ہندوؤں کی چھوت چھات اور ہندو ساہوکاروں کی بددیانتیاں قرار دیتے ہیں۔ وہ ملوکیت کے ہاتھوں میں بھی کھیلنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ انہیں انسان کی طرف سے دی ہوئی تکالیف سے چھٹکارا پانے کی امید دلائی جائے۔ برطانی شہنشاہیت ہمارے برادرانِ وطن کے سلوک سے زیادہ بری نہیں۔ میری اس غیر حب الوطنی کے جذبہ پر ہندو حقارت آمیز ہنسی ہنس دیں گے لیکن خود چھوت اسی حب الوطنی کے منافی ہے۔ ہمارے جن ہم وطنوں کو سوائے ہوسِ زر کے اور کسی چیز کا احساس ہی نہیں وہ غریب مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو کیا سمجھیں گے؟ وہ خوش فہم مسلمان علما جو پاکستان کے خلاف تبلیغ اسلام کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ سماج کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان عوام کی نبض نہیں پہچان سکتے جنہیں روزانہ ہندوؤں کے ہاتھوں بے عزتی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اگر پاکستان سکیم سے مسلم لیگ کا مقصد چند ایک فوائد حاصل کرنا اور ہندوؤں کو موجودہ سلوک جاری رکھنے کی اجازت دینا نہیں تو پاکستان کو ایک حقیقت کاملہ سمجھنا چاہیئے۔ اور پاکستانی صورت کو اب صرف مسلم لیگی لیڈروں کی بزدلی یا اونچی جاتی کے ہندوؤں کے رویّہ کی تبدیلی ہی بدل سکتی ہے

بعض نکتہ بین مسلمان پاکستانی سکیم کو مالی اعتبار سے ناقص قرار دیتے ہیں۔ گھاٹے کے بجٹ سے حکومت چلانا ناممکن ہے لیکن بڑی بڑی نوکریاں اگر ختم کر دی جائیں۔ اور کام کرنے کا عزم دل میں موجود ہو تو دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں ہے جو اپنی حکومت کی سادہ سی مشین نہ چلا سکے۔ اگر ایک قوم کے لئے زندگی دو بھر کر دی جائے تو یہ قدرتی بات ہے کہ وہ آزادی کا

سانس لینے کے لئے کسی قسم کی تکلیف کو خاطر میں نہ لاتے گی۔ بے عزتی کی زندگی، زندگی نہیں۔ مسلمان جہنم کے پاکستان میں حکومت کرنے کو ہندوؤں کی جنت کی غلامی پر ترجیح دیں گے۔

وحدانی نظامِ حکومت اور موجودہ سماجی و اقتصادی نظام سے مسلمان شودروں کی پستی کو پہنچ جائیں گے۔ اگر موجودہ مجلسی و اقتصادی نظام کو طویل عرصہ تک باقی رہنا ہے تو وحدانی نظام کی نسبت پاکستانی سکیم مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید رہے گی۔ جب لکھنؤ میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ تو میں نے اُن احباب کی نمائندگی کرتے ہوئے جن پر اب مجلسِ احرار مشتمل ہے۔ یہ کہا تھا کہ اس رپورٹ میں جو نظامِ حکومت پیش کیا گیا ہے وہ ملک کے لئے مفید ثابت نہیں ہوگا کیونکہ اس سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے مستقبل کے متعلق کئی خوفناک شکوک پیدا ہو جائیں گے مسلمانوں نے اس وقت میری رائے کو کچھ اہمیت نہ دی۔ اور ہندو لیڈروں نے میری وفاقی نظام کی تجویز کو ٹھکرا دیا۔ وفاقی نظام صرف ہندوستان ایسے چھوٹے سے براعظم ہی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اب مرکز میں نمائندہ حکومت قائم کرنے سے قبل صوبجاتی خود مختاری دے دی گئی ہے۔ اس لئے اب مسلمانوں کا مطالبہ ہو سکتا ہے کہ مرکز کو تھوڑے مالیتی اختیارات دیئے جائیں۔ صوبجاتی خود مختاری کے اجرا نے صوبجات کو یہ قدرتی حق عطا کر دیا ہے کہ وہ جب چاہیں باقی ہندوستان سے علیحدہ ہو جائیں۔ اس طرح ایک حقیقی وفاقی نظام میں مسلمان عملی طور پر پاکستان ہی میں رہیں گے اور یہ مسلمانوں کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ وہ ہندوستان ہی میں رہیں یا اپنے لئے ایک علیحدہ وطن پسند کر دیں۔

مسلمانوں کے لئے پاکستان اور وفاقی ہندوستان میں کچھ فرق نہیں۔ اگر وہ وفاقی ہندوستان میں رہیں گے تو صرف اس لئے کہ اس میں ان کا فائدہ ہے۔ اگر اس میں وہ آرام

کی زندگی بسر نہ کر سکے۔ تو قدرتی طور پر وہ ہندو انڈیا سے علیحدہ ہو جانا چاہیں گے۔ اس لئے ملکی اور ملّی ہر دو نقطہ ہائے نگاہ سے پاکستان کا نعرہ اس وقت صحیح نہیں ہے۔ ہمیں پہلے آزادی حاصل کرنی چاہیئے اور پھر کچھ عرصہ اپنے اختلافات مٹانے اور عمرانی و اقتصادی انقلاب کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمیں اپنی تمام تر توجہات ہندوستان کو خالی از طبقات سماج بنانے پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔ آزادی کے بعد مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی اچھوتوں کی طرح رہنا گوارا نہ کریں گے۔ سماجی ذلت غلامی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ سوراج ہماری موجودہ کشمکش کا قدرتی نتیجہ ہوگا۔ اور سوراج کے بعد مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد وہ اس سماجی سلوک کے خلاف دوگنی قوت سے احتجاج کریں گے۔ جب ایک قوم کو ذلیل سلوک کا احساس ہو جائے تو رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کا احتجاج بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ہر ہندو اور ہر قوم پرست مسلمان کو آگاہ رہنا چاہیئے کہ مسلمان قوم کو ذلیل سماجی سلوک کا دن بدن احساس ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگرچہ پاکستانی سکیم خطرات سے خالی نہیں لیکن مسلمان اپنے ہندو ہمسایوں سے جدا ہو جانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ رہ کر انہیں آرام میسر نہیں۔ ہندوؤں نے ابھی تک اتنا بھی نہیں سیکھا کہ اپنے ہموطنوں کو اپنے برابر سمجھنا چاہیئے۔ ایک ایسا وفاق جس میں صوبجات آزاد ہوں۔ اور مرکز کو ماںبقی اختیارات حاصل ہوں مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ اگر ہندو اپنے رویہ میں خاطر خواہ تبدیلی کر لیں تو مسلمان مرکز کو روز افزوں اختیارات دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن ہندو مہاسبھا کے زیرِ اثر اگر ہندو نے مسلمان کے ساتھ درشت سلوک جاری رکھا تو تحریکِ پاکستان مضبوط ہوتی چلی جائے گی۔

کانگرس کے سابق صدر ریسری نواس آئنگر آنجہانی ایک نکتہ رس انسان تھے۔ آخر دم تک وہ ہندو مسلم مسئلہ کو ایک سیاسی مسئلہ سمجھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کے سیاسی

مطالبات پورے کر دیئے جائیں۔ تو دونوں قوموں میں اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ وہ مسلمانوں کو مرکز میں نصف حصّہ تک دینے کو تیار تھے۔ مجھے ان کے اس نظریہ سے اختلاف ہے۔ میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جو ہندو مسلم سوال کو سیاسی نہیں بلکہ سماجی و اقتصادی مسئلہ سمجھتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اقتصادی لحاظ سے کمیرے اور سماجی طور پر ذلیل بنا دیا جائے۔ تو خواہ اس کے چند افراد کو اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز کر دیا جائے۔ اس قوم کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ خود عوام بھی اس چیز کا مطالبہ کریں گے کہ سماجی مساوات اور اقتصادی انصاف کے لئے جلد از جلد قوانین بنائے جائیں۔ اگر موجودہ سماجی اور اقتصادی حالات کو باقی رہنا ہے تو یہ کشمکش اور چپقلش بھی جاری رہے گی بغیر سماجی اور اقتصادی انصاف کے سیاسی حقوق لایعنی ہیں۔ مرکز میں زیادہ حصے داری اور صوبجات کی زیادہ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندو عوام کے قلوب میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ورنہ سیاسی حقوق مسلمانوں کو ہندوؤں کے اور قریب لے جائیں گے۔ اور اس قرب سے دونوں قوموں کا نزاع اور بڑھ جائے گا۔

"اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ ہمیشہ بلند کیا جاتا ہے۔ اس نعرہ کو سن کر ایک عامی مسلمان جو اسلام کی تعلیمات سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتا اپنے مذہب کی خاطر ہر ممکن قربانی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس خطرہ کو قبل از وقت ہی محسوس کر لیا تھا۔ اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مقدمات ان کے اپنے منصف اور قاضی سنیں گے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ کمپنی کے عہدِ حکومت کی طرح سوراج کے بعد بھی مسلمانوں کے شخصی قانون کا نفاذ ہو گا۔ اور مسلمانوں کے مقدمات قاضی ہی سنیں گے۔ مجلس احرار کے رہنماؤں نے ملک کی دوسری جماعتوں کی توجہ اس مطالبہ کی طرف مبذول کرائی تھی۔ مجھے یہ علم ہے کہ مسلمانوں کا اونچا طبقہ اس مطالبہ کا حامی نہیں کیونکہ وہ اپنی جائداد کی اسلامی

قانون کے مطابق تقسیم نہیں چاہتا۔ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ کانگرسی لیڈر اس مطالبہ کے خلاف نہیں ہیں۔ کراچی کانگرس میں یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ کہ آزاد ہندوستان میں ہر قوم کے شخصی قانون کی حفاظت کی جائے گی لیکن اس فیصلہ کے بعد مسلمانوں کی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا گیا کیونکہ ان کا با اثر طبقہ اس مطالبہ کے لئے کوئی سرگرمی نہیں دکھلا رہا۔

المختصر اگر مسلمانوں کو مرکز میں مناسب حصہ دیا جائے صوبجات کو زیادہ اختیارات حاصل ہوں۔ اور مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ مسلمان قاضی اسلامی شریعت کے مطابق کریں تو مسلمان ہندوستان میں پاکستان کی طرح محفوظ ہوں گے بشرطیکہ صوبجاتی اور مرکزی حکومتیں سماجی اور اقتصادی انصاف پر مبنی ہوں۔ سماجی ظلم اور اقتصادی مقاطعہ کو گناہ عظیم سمجھا جائے ورنہ مسلمانوں کی رائے عامہ پاکستان کے لئے آواز بلند کرتی رہے گی جہاں انہیں امن اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کی امید ہے۔

پاکستان کے تمام علمبردار یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں بھی آج کل کی طرح ہندو اور سکھ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ لیکن ہندو اور سکھ اپنے موجودہ چھوت چھات کے تعصبات سے پاکستان کو بھی اچھوتستان بنا دیں گے۔ اور شاید مسلمان اُس وقت مسلمان آبادیوں کے تبادلہ کے لئے کوئی نئی تجویز سوچیں لیکن اس کے لئے بہت دقّت کا سامنا ہوگا۔ کیا مسلم لیگ کے موجودہ رہنما اتنے مضبوط اور با اثر ہیں کہ آبادیوں کا تبادلہ کرا سکیں ؟ میں مسلم لیگ کو ہمیشہ کاہلوں اور مفت خوروں کی ٹولی سمجھتا رہا ہوں۔ انہوں نے پاکستانی سکیم کے خوفناک نتائج پر غور نہیں کیا۔ وہ نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوا میں قلعے تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ دیانتداری کے ساتھ اسی امید میں مگن ہیں کہ حکومت برطانیہ پاکستان کو ان کے لئے آرام دہ وطن بنا دے گی بیوقوف فولی کی جنت میں بسنے والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے فائدہ کی امید میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر حقیقت ہے

کہ جب تک مسلمان سر دھڑ کی بازی نہ لگائیں گے۔ ان کی توقعات بر نہ آئیں گی لیکن میرے پیش نظر ایک زیادہ قابلِ عمل تجویز ہے وفاقی ہندوستان میں مسلمانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اگر وہ یہ محسوس کریں۔ کہ وفاقی ہندوستان کی زندگی بھی اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ تو انہیں ہر وقت ہندوانڈیا سے علیحدگی کا اختیار ہو گا۔ مگر آج ہندوستان کی تقسیم کا مطلب قوم کو انتہائی اقدامات پر آمادہ کرنا ہے۔ حالانکہ یہ اقدامات زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔

ہم کب تک ہندوستان میں کتے اور بلی کی طرح لڑتے جھگڑتے زندگی بسر کریں گے؟ میں یہ معلوم کر کے خوش ہوا ہوں کہ گاندھی جی نے یہ دانشمندانہ اعلان کر دیا ہے کہ پاکستان سکیم کوئی آفت نہیں ہے۔ اگر ہم اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہ سکیں۔ تو ہمیں دوستوں کی حیثیت میں جدا ہو نا چاہیئے۔

میرا مسلمانوں کو یہ مشورہ ہے کہ ہم اپنے روزِ استخلاص کو قریب لانے کے بجائے پاکستان کی خیالی سکیم کے بحث و مذاکرہ پر کیوں اپنا وقت ضائع کریں۔ کیونکہ جب تک ہم غیر ملکی جوا اپنی گردنوں سے اتار نہیں پھینکتے۔ اُس وقت تک اس سکیم کو کوئی عملی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔"

خلاصۂ کلام

پُرانا نظامِ عالم ختم ہو رہا ہے. کچھ عرصہ بعد اس کا ذکر تک بھی نہ ہوگا. ہر بُرائی میں اچھائی کی جھلک بھی ہوتی ہے. موجودہ جنگِ یورپ سے بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی یقیناً مفید نتائج حاصل کریں گے. ہمیں مستقبل سے خوش آئند امیدیں وابستہ کرنی چاہئیں. عالمگیر انقلاب ہندوستانیوں کی ذہنیت میں بھی انقلاب پیدا کر دے گا. اگرچہ ہم نحیف اور کمزور ہو چکے ہیں لیکن یہ عالمگیر کشمکش ہماری مضبوطی اور قوت کا باعث ہوگی. ہم ہندوستان کو نئی بنیادوں پر استوار کر کے تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک نمونہ بنا دیں گے. میں کوئی مبہم نظریہ پیش نہیں کر رہا بلکہ میں تو اعلانیہ یہی کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں لیکن پھر بھی مجھے امید ہے کہ جب ہم غیر ملکی جوئے کو اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں گے تو

ہندوستان تمام دنیا کو امن و ثروت کی طرف لے جائے گا۔

بعض مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوؤں کی ذہنیت قطعاً بدلی نہیں جا سکتی اس لئے وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔ اور تقسیم ہند ہی کو اس مسئلے کا واحد حل سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ نے مسلمانوں کو تمام ذرائع سے محروم کر دیا ہے۔ اس خیال کے مسلمانوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اب صرف سرکاری نوکری ہی ہم سب کا منتہائے مقصود بن چکی ہے۔ ہمیں اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ نہیں۔ اور خوشامدیوں کی طرح سرکاری بخششوں پر ہمارا دارومدار ہے۔ مسلمان تو خدا کا سپاہی تھا۔ وہ قوموں کی رہنمائی کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ مگر اب طاؤس ورباب نے قربانی کی جگہ لے لی ہے۔ وہ خدا کے اس وعدے کو بھول چکے ہیں۔ کہ جو ہمیشہ صداقت کا ساتھ دیں گے! اور لوگوں کی فلاح کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے وہ بہت جلد موعودہ مقام پر پہنچ جائیں گے۔ جہاں ان کی قربانیوں کا معاوضہ انہیں ملے گا۔ مسلمان فرض کی پکار کو کیوں شکست خوردہ انسان کی طرح سنتے ہیں۔ اسلام تو لَا تَقْنَطُوْا (مایوس نہ ہو) کی تعلیم دیتا ہے! اور ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو کہتا ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ موجودہ فضا مسلمانوں کے لئے تنگ ہو چکی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ سماجی اور اقتصادی عمارت تعمیر کرنے کے لئے صبر آزما مساعی کی ضرورت ہے۔ اور میں نے اس چیز کا حل پیش کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں نے سیاسی ترقی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے! اور موجودہ حالات کو سدھار کر مستقبل میں سماجی ہم آہنگی و یک جہتی پیدا کرنے کے لئے تقریباً کچھ نہیں کیا۔ زمانہ عظیم خطرات کے آثار پیش کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو دانش مندی سے کام لے کر ان خطرات کا احساس کرنا چاہیئے۔ جدوجہد کے بعد ہی وہ خاطر خواہ اطمینان حاصل کر سکتے ہیں ہمیں ایک ایسی قوم کو جھکانا ہے جو صدیوں سے حماقتیں کرتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے

ہمت و احتیاط سے کام لینا چاہیئے ہمیں اپنے سماجی اور اقتصادی انقلاب کی تجویز پر غیر متزلزل
یقین کے ساتھ عمل کرنا ہوگا لیکن ہندو قوم کے خلاف ہمیں اعلانِ جنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم
پر جو مصائب ہندوؤں نے نازل کیئے ہیں ہمیں ان سے رہائی حاصل کرنے کا حق حاصل
ہے لیکن ہمیں دونوں قوموں کے تعلقات کو خراب نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندو نہایت طمطراق
کے ساتھ مسلمان سے چھوت چھات کا سلوک کر رہا ہے۔ لیکن ہمیں اس کی تقلید نہیں کرنی
چاہیئے۔ ہمیں ہندو کو یہ یقین دلانا چاہیئے کہ ہم اس کے سلوک سے مطمئن نہیں ہیں۔ اور اپنے
فیاضانہ افعال سے اُس پر اپنی نیک نیتی ثابت کرنی چاہیئے۔ ہمیں سچا مسلمان بننا چاہیئے۔ جو
سب کا دوست اور کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ اور امداد کے مستحق کی امداد کو ہر وقت تیار رہتا ہے
ہر ایک کی مساوی سوشل خدمت ہماری امتیازی صفت ہونی چاہیئے۔ ہمیں اپنے ہندو ہمسایوں
کے دل سے تمام ڈر اور شکوک دُور کرنے ہوں گے۔ وہ ہمارے نصب العین کو ہمیشہ مشتبہ نگاہوں
سے دیکھتے ہیں۔ انہیں صاف الفاظ میں یہ بتا دو کہ جو سلوک وہ مسلمانوں سے کر رہے ہیں پاکستان
تحریک اس کی وجہ سے زور پکڑ رہی ہے لیکن اپنے ہندو ہم وطنوں کی خدمت کرنے سے کبھی
دریغ نہ کرو۔ تمہیں یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ پاکستان سکیم شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ اور اگر
ہم ہندو کی ذہنیت کو نہ بدل سکے۔ تو اس حالت میں ہمارا آخری چارہ کار ہو سکتا ہے۔ وگرنہ
ہمارے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ زور بازو کے بجائے خدمت اور قربانی سے ہندوستانی عوام
کی رہنمائی کریں۔ ہر شخص کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ اور اس طرح اپنے اسلامی اخلاق کا ثبوت
دو۔ دنیا کو صاف کہہ دو کہ ہم اچھوت نہیں بن سکتے۔ لیکن شودروں کو تم خود انسان سمجھو زبانی
جمع خرچ اور نظری فیاضی سے شودروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ چھوت کے دیو کو جلا دو
اور شودروں کو اس کے پنجے سے نجات دلاؤ۔ ماضی کے تمام تعصبات دور کر دو۔ اس بات کو

ذہن نشین کرلو کہ انسانوں سے جو حیوانوں کا سا سلوک ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اور اسی لئے خدا ہم سے ناراض ہے۔ شودروں سے اپنے گزشتہ افعال کے لئے دوزانو ہو کر معافی مانگو اور خداوند کریم سے دعا کرو کہ وہ ہمیں یہ توفیق ارزانی کرے کہ نیچی جاتی کے لوگوں کو ہم نئے سماجی نظام میں مساوی حیثیت دلا سکیں۔ ہم نے اپنے وطنی بھائیوں سے ذلیل سلوک کیا۔ اور خدا نے ہم پر غیر ملکی اقتدار کا عذاب نازل کر دیا۔ اپنے رویئے کو بدلو۔ عادات کی اصلاح کرو۔ اور اپنے ہمسایوں خصوصاً شودروں کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہنا سیکھو۔ صرف اسی صورت میں ہمارے عہدِ جدید کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ہم ہندوستان کھو چکے ہیں۔ اور اگر ہم اپنی غلامانہ ذہنیت دور کر کے اسلام کے سچے سپاہی نہ بنے تو ہمیں پاکستان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

مسلمان بھائیو! مسلمانوں کی اکثریت پہلے ہی پاکستان میں رہتی ہے۔ ہمارے پاس اکثریت کے صوبے موجود ہیں۔ ہماری تعداد نو کروڑ ہے لیکن ہم نے سچے مسلمان کی طرح رہنے کا عزم نہیں کیا۔ دوسروں کو غلام بنانے کا خیال چھوڑ دو۔ اور اپنے بلند اخلاق، عظیم قربانیوں اور مسلسل خدمات سے دوسروں پر اپنی فوقیت ثابت کرو۔ ہماری زندگی کا مقصد دوسروں کو لوٹنا نہیں۔ بلکہ دوسری قوم کے دل کو رحم و مروّت سے جیتنا ہے۔ صرف لوگوں کی صحیح رہنمائی ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے۔ بادشاہوں کے تاج چھیننے کا لالچ نہ کرو۔ اور نہ دوسری اقوام کی دولت کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھو۔ دولت کو مساوی طور پر تقسیم کر دو۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں سے انصاف برتو ہمیں دنیا کو امن و خوشحالی کی طرف لے جانا ہے۔ اس لئے اپنی سیرت کو بلند بناؤ۔ ہمیں مصائب کے دلدلوں میں انسانیت کا شت کرنا ہے۔ ہمیں ہندوستان میں ایک ایسی قوم کی طرح رہنا چاہیئے جو اخلاقی اعتبار سے مضبوط اور ضرورت مند کی امداد کو ہمیشہ تیار رہو۔

بے کسوں اور اچھوتوں کی طرح رہنا مسلمانوں کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ پہلے چھوت چھات کو ختم اور ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرو۔ اگر اس کے بعد بھی ہندو قوم کی روش تلخ رہے اور وہ ہم سے پہلے سا سلوک کرنا چاہتی ہو تو ہمیں ہندوستان کو دو آرام دہ گھروں ۔۔۔ ہندوستان اور پاکستان ۔۔۔ میں تقسیم کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ موعودہ گھر کہاں ہے؟ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ کسی شخص کو ان چیزوں کا علم نہیں۔ اور شاید قیامت تک نہ ہو۔ ہمیں سراب کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیئے بلکہ مضبوط اخلاق کے مالک اچھے شہریوں کی طرح ہندوستان میں رہنا چاہیئے۔ ہمیں دیگر اقوام کے پست طبقات کے ساتھ تعاون کر کے سماجی مساوات اور اقتصادی انصاف کے لئے کوشاں ہونا چاہیئے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ میری اپنی قوم کے نواب اور خطاب یافتگان میری اس تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیں گے۔ کیونکہ وہ خود بھی سماجی مساوات اور اقتصادی انصاف میں یقین نہیں رکھتے۔ ہندو سرمایہ دار ایک ایسا ہندوستان چاہتے ہیں جہاں وہ ہر قوم کے غریب طبقات کی قسمتوں پر بآسانی مسلط ہو سکیں۔ اونچے گھروں کے مسلمان ایک ایسا پاکستان چاہتے ہیں۔ جہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے غریب طبقوں کو مساوی طور پر لوٹ سکیں۔ اعلیٰ طبقہ کے سکھ ایک ایسا پنجاب چاہتے ہیں۔ جہاں وہ ہندو مسلمان اور سکھ عوام پر بآسانی حکومت کر سکیں اور انہیں لوٹ سکیں۔ ہندوستان کی تقسیم کا نعرہ دراصل ان تینوں قوموں کے اعلیٰ طبقات کا نعرہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ یہ کوئی فرقہ وارانہ مطالبہ ہے۔ بلکہ یہ ایک اہم تدبیر ہے جو اس لئے پھیلایا گیا ہے کہ کہیں غریب طبقے اپنے ذہن و دماغ اور اپنی تمام تر قوتیں سماجی اور اقتصادی انصاف کے اہم مسائل پر مرکوز نہ کر دیں۔ وہ دن ہندوستان کے لئے بدقسمتی کا دن ہو گا جب کانگرس اور مسلم لیگ کی چپقلش ختم ہو جائے گی۔ اور دونوں قوموں کے سرمایہ دار عوام کو لوٹنے کے لئے متحد ہو جائیں گے۔

اونچے طبقات کی یہ کش مکش زحمت کے پردے میں ایک رحمت ہے خدا اسے دوام بخشے تاکہ عوام فائدہ اٹھاسکیں۔

لیکن ہم احرار کو غالی لغاظی میں اور کانگرس کی بڑی بڑی مشین گنوں اور مسلم لیگ کے بڑے بڑے نقاروں کے گفتار و کردار پر نکتہ چینی کرنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ مستقبل کے تفکرات نے ہمارے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت کر دی ہے۔ اور یہ دنیا ہمارے لیئے آنسوؤں کی وادی بن چکی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جرأت سے کام لے کر آگے قدم بڑھائیں۔ اور دُنیا میں یہ اعلان کر دیں کہ ہم احرار کا نصب العین مندرجہ ذیل ہے :۔

۱۔ ملک کی دولت کی مساوی تقسیم

۲۔ چھوت چھات کا خاتمہ

۳۔ ہر مذہب کا احترام اور شریعت کے مطابق رہنے کی مکمل آزادی۔

اگر ہندو قوم کسی طرح بھی ہمارے راستے میں حائل ہوئی تو اس صورت میں اور محض اسی صورت میں ہمیں مسٹر جناح کے ساتھ مل کر پاکستان کا نعرہ بلند کرنا چاہیئے۔ مسلمان اب ہندوؤں کے اقتصادی طور پر کمیرے اور سماجی لحاظ سے ان کے اچھوت رہنے کو تیار نہیں۔ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں۔ کہ پاکستان ایک ناقابلِ عمل سکیم ہے لیکن ہم مسلم لیگ سے اپنے اختلافات دور کر کے اُن قوتوں کے ساتھ لڑیں گے جو ہمارے زوال و ادبار کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ہم آزادیِ ہند کے لئے سرگرمِ پیکار رہیں۔ لیکن ہم اس امر کا اعلان بھی کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان اب کسی قوم یا طبقہ کے اجیر بن کر رہنے کو تیار نہیں۔